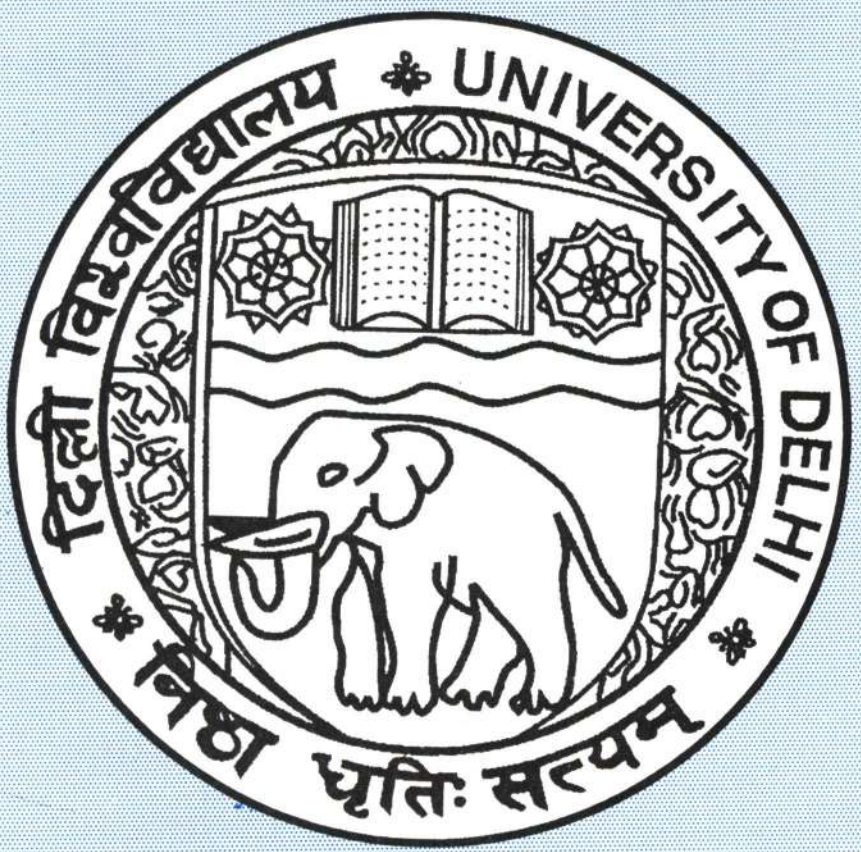
B.Com. III Year Urdu-B

PAPER XV : Urdu

Prose

Study Material : 1 (1-11)



SCHOOL OF OPEN LEARNING
(Campus of Open Learning)
University of Delhi

Department of Urdu
Editor : Dr. Md. Asghar Ali

List of Lesson B. Com 3rd Year Stream "B" Prose

Prose

1.	Urdu Zaban Ka Irtiqa	Dr. Khudaija Tahira
2.	Urdu Adab Ka Mukhtasar Taruf	Dr. Khudaija Tahira
3.	Urdu Nasar Ek Taruf	Dr. Khudaija Tahira
4.	Altaf Hussain Hali	Dr. Khudaija Tahira
5.	Mohd Hussain Azad	Dr. Nasreen Khan
6.	Mukhtasar Afsana	Dr. Khudaija Tahira
7.	Prem Chand	Dr. Khudaija Tahira
8.	Pitras Bukhari	Dr. Nasreen Khan
9.	Ilme Bayan	Dr. Khudaija Tahira
10.	Farhang-e Istalahat (Quami council Farog Brai urdu Zaban)	Dr. Khudaija Tahira
11.	Mazmun Nigari Tarjuma Nigari aur Tashreeh	Dr. Khudaija Tahira

فہرست

نثر

(B. Com II/III Year Stream B)

مضمون	صفحہ	مضمون نگار
1- اردو زبان کا ارتقاء	4	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
2- اردو ادب کا مختصر جائزہ	7	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
3- اردو نثر	13	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
4- مولانا الطاف حسین حالی	18	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
5- مولانا محمد حسین آزاد	26	ڈاکٹر نسرین رئیس خان
6- مختصر افسانہ	35	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
7- پریم چند	38	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
8- پطرس بخاری	41	ڈاکٹر نسرین رئیس خان
9- علم بیان اقسام نثر و اقسام شاعری	44	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
10- ترجمہ نگاری مضمون نگاری اور تشریح	50	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ
11- فرہنگ اصطلاحات (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)	55	ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

ڈاکٹر خدیجہ طاہر

اردو زبان کا ارتقاء

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے جہاں مختلف مذہب کے ماننے والے مختلف فرقے اور برادری کے لوگ رہتے ہیں ظاہری بات ہے ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہوں گی لیکن ہندوستان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ یہ سب ہونے کے باوجود ملک کی ملی جلی تہذیب قومی یکجہتی رکھ رکھاؤ قائم و دائم ہے اور یہی بات قابل تعریف ہے۔

اس انسانی سماج میں زبان کا بڑا درجہ اور ادب کی بڑی حیثیت ہے سماج میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں وہ زبان و ادب میں خاص شان و شوکت اور اثر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ اس انسانی سماج کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے تو پتا چلتا ہے کہ اسکی جانورں کا شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ زندگی میں بے ترتیبی تھی تو زبان بھی کیسی ہوگی۔ اس وقت لوگ قبیلے میں رہتے تھے۔ ان کے مذہب اور تیوہار الگ الگ تھے۔ ہزاروں سال بعد دراوڈ آئے۔ یہ قوم مغرب سے آئی اور تامل ناڈو، میسور، آندھراپردیش، اور کیرل کے علاقوں میں بس گئے۔ یہ لوگ وہی کی مقامی بولتی بولتے تھے۔ ہندوستان سے باہر مثلاً ایران چین اور ترکستان وغیرہ ہیں۔ آریہ قوم آباد تھی۔ یہ لوگ بڑے محنت کش تھے۔ کاشت کاری کرتے تھے ان لوگوں کی زبان سنسکرت سے ملتی جلتی تھی جو آریائی زبان کہلاتی تھی۔ موہن جوداڑو اور ہڑپا ان کے شہر تھے۔ جن کے کھنڈر پاکستان اور ہندوستان کے شہر راجستھان میں ملتے ہیں۔ سنسکرت اس وقت کے بڑے لوگ یعنی ہندو برہمن کی زبان تھی۔ عام لوگوں کے لئے یہ مشکل زبان تھی۔ وہ جو زبان بولتے تھے اسے پراکرت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہندوستان جہاں بڑے بڑے سورماؤں اور مذہبی پیشوا پیدا ہئے انہوں نے اپنی بات عام عوام تک پہونچانے کے لئے زبان کا سہارا لیا ہوگا۔ بدھ مذہب چونکہ بہت تیزی سے پھیلا۔ دوسرے ممالک کو اپنا مسکن بنایا۔ مثلاً چین، جاپان، ملایا، انڈونیشیا، ایران وغیرہ، سنسکرت زبان و اس دور میں نقصان پہونچا۔ دیگر زبانوں نے اپنا گھر بنایا۔ شمالی ہندوستان میں اکثرت بولی جاتی تھی۔ اس کے بطن سے دو اور زبانوں کی پیدائش ہوئی۔ جس کو ہندوستان میں ہندی اردو کہتے ہیں۔

۱۰۰۰ء بعد جو نئی نئی زبانیں وجود میں آئیں بولی جانے لگیں ان میں اردو زبان بھی ایک ہے۔ یہ زبان کہیں باہر سے نہیں

آئی۔ ہندوستان میں پیدا ہوئی اس کے لئے اس کی شکل خالص ہندوستانی ہے۔

آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد نے لکھا ہے'' ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اور شاہی دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے اس لئے وہاں کی بولی کا نام اردو پڑ گیا''۔

جس طرح لشکر میں جگہ جگہ کے لوگ جن کا تعلق مختلف مذہب سے ہوتا ہے جن کی زبانیں بھی الگ الگ کھانے پینے کے طرز عادات و اطوار الگ مگر پھر بھی ایک ساتھ رہتے ہیں اردو زبان کی ابتداء کا عمل بھی ایسا ہی ہے۔

ساتویں صدی میں عربی ایران افغانی ترکستانی اور مغل ہندوستان میں داخل ہونے لگے۔ ان کے تعلقات دوسرے لوگوں سے ہے جن کی بولیاں مختلف تھیں۔ عربی فارسی اور ترکی زبان کے الفاظ بھی ملنے لگے۔ باہر سے آنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ پنجاب ان کا مسکن تھا۔ وہاں کی مقامی بولی اور مسلمانوں کی بولی سے ملکر ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ جسے اردو کہا گیا۔ دلی کی آس پاس کی بولیوں سے آنے والے مسلمانوں کی بولیوں کا تال میل ہوا۔ اردو کو مزید ترقی ہوئی۔ بعد میں جب دلی دارالسلطنت بن گیا تو ہر شخص دلی کی طرف آیا۔ آس پاس کی بولیاں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ زبانوں کا آپس میں میل ہوا۔ شاید اسی لئے شروع کی اردو زبان پر دوسری زبانوں کا کافی اثر تھا۔ میرٹھ میں کھڑی بولی عام تھی۔ بعد میں دوسری زبانیں یعنی فارسی عربی اور ترکی زبانیں اس میں شامل ہوگئیں۔ ان اثرات سے اردو زبان اور نکھر گئی۔ شاعری کی زبان بن گئی لوگ ادھر ادھر آ گئے زبان میں منتقل ہوئی رہی چاہے وہ فوجی ہوں سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔ بات چیت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے جو زبان دلی میں بولی جاتی تھی۔ وہ پورے ہندوستان میں پھیلنے لگی۔

بادشاہ علاؤ الدین خلجی نے جب جنوبی ہندوستان کو فتح کیا۔ دلی کا اثر جنوب میں کرناٹک اور مشرق میں بنگال تک پھیل گیا۔ ۱۳۲۷ء میں جب محمد تغلق نے اپنا دارالسلطنت دلی سے دولت آباد منتقل کیا۔ اور لوگوں کو حکم دیا کہ سب وہاں چلے جائیں حکم کی تعمیل ہوئی منتقل ہونے والے اپنی زبان بھی ساتھ لے گئے۔ دکن نے مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ لہٰذا اردو زبان کا مرکز بھی دکن بن گیا۔ جو پہلے شمالی ہندوستان بن گیا۔

مسلمان ہندوستان میں آتے رہے کچھ تو چلے گئے۔ زیادہ تر لوگ یہی بس گئے۔ وقت کے نشیب و فراز نے کبھی تو انہیں بادشاہ بنایا کبھی فقیری کے دن کاٹنے پر مجبور کیا۔ کبھی تو انہیں زبان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس سلسلہ میں امیر خسرو کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ جو بیک وقت شاعر بھی تھے۔ گایک بھی سب کے مخلص، فارسی زبان میں مہارت تھی۔ فارسی میں کئی کتابیں لکھیں مگر جو کچھ انہوں نے ہندوستانی زبان میں لکھا وہ نا قابل فراموش ہے۔ انہوں نے دوہے گیت پہلیاں بھی لکھیں۔ اس وقت تک اردو کی اپنی الگ سے کوئی پہچان نہیں تھی۔ اس لئے ان کی بولی کبھی کھڑی بولی یعنی ہندوستان سے ملتی ہے کبھی برج بھاشا سے (جو متھرا میں بولی جاتی ہے) ان بولیوں کے علاوہ بھی دوسری بولیاں نظر آتی ہیں۔ اس لئے ہندی زبان جاننے والے ان کو اپنا شاعر مانتے ہیں۔ اردو والے اپنا۔ خسرو کی پہلیاں مشہور ہیں۔ جو تیرہویں اور چودھویں صدی میں دلی کی زبان کا آئینہ ہیں۔

تھا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا

خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں بوجھو نہیں تو چھوڑوں گاؤں (چراغ)

دس ناری ایک نر بستی بار ہروا گھر

پیٹھ سخت اور پیٹ نرم منھ میٹھا تاثیر گرم (خربوزہ)

اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو دہلی کے قریب پیدا ہوئی، اور دھیرے دھیرے پھیلنے لگی شروع میں اس کا نام ہند، ہندی، ہندوی، اور دہلوی، بعد میں ہندی کے نام سے یاد کی گئی۔ جب یہ کن میں پہونچی تو اردو کا نام دکنی اور گجری ہوگیا۔ دہلی میں شاعری کی زبان کو ریختہ کہتے تھے اور کبھی کبھی اردوئے معلیٰ بھی کہا گیا۔ اورنگ زیب کے دورحکومت میں اس نے مستقل صورت اختیار کرلی۔

مگر اردو شعر و ادب کا باقاعدہ آغاز دکن میں شروع ہوا۔ اردو میں سیکڑوں کتابیں شاعری اور نثر میں لکھی گئی قلی قطب شاہ جو کہ صاحبِ دیوان شاعر تھا اہل علم تھا شاعروں اور ادیبوں کا اکرام کرتا تھا۔ انعام وغیرہ بھی دلواتا تھا۔قلی قطب شاہ کے خاندان میں تین اور بادشاہ گذرے ہیں جو شاعر بھی تھے۔ دکن کے تین ادیب وجہی، ابن نشاطی، اور غواصی بھی تھے۔ جنہوں نے قصے کہانیاں لکھیں۔ بادشاہ ابراہیم عادم شاہ نے گیتوں کی ایک کتاب لکھی۔ نورس لکھیں۔ بادشاہ ابراہیم شاہ نے گیتوں کی ایک کتاب لکھی۔ نورس کے نام سے جس میں برج بھاشا اور شمالی ہندی کے الفاظ شامل ہیں اورنگ زیب نے جب شمال اور جنوب پر قبضہ کرلیا اسی دور میں اردو زبان کے شعر و ادب نے بڑی ترقی کی۔ غزل مثنوی، قصیدے، مرثیے کہانیاں اور مذہبی ادب بڑی تعداد میں شائع ہوا۔ اس دور میں داخل ہونے تک دکنی اردو ایک بڑی اور مضبوط زبان بنکر ابھری۔ جس کا رسم الخط فارسی تھا اس وقت تک اردو کو ہندی کہا جاتا تھا۔ ماحصل یہ کہ اردو عہد بہ ترقی رہی اور ہندوستان کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے۔

اردو زبان ہمیشہ یہاں کی قومی زندگی پر اثر انداز ہوئی ہمیشہ ہر دور میں زندگی کے اچھے پہلوؤں اور اخلاقی تصورات کو اہمیت دی اس نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ اردو شاعروں ادیبوں نے جیل میں سختیاں سہیں انقلاب کا نعرہ دیا۔ ملک کی عظمت میں چار چاند لگایا۔ بقول رضا جونپوری۔

شائستگی کی ضامن تہذیب کی محافظ عفت کی پاسباں ہے میری زبان اردو

آزاد کی حکایت اقبال کا فسانہ غالب کی داستاں سے میری زبان اردو

دارورسن سے گزری زنداں میں دن گزارے اصرار کا نشاں ہے میری زبان اردو

دین وشعور میں جو یک انقلاب لائی وہ مایۂ گراں ہے میری زبان اردو

یہ سنگ وخشت ہیں کیا روکیں گے راہ اس کی یک سیل بے کراں ہے میری زبان اردو

☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

اردو ادب کا مختصر تعارف

شائستگی کی ضامن تہذیب کی محافظ — عفت کی پاسباں ہے میری زبان اردو
آزاد کی حکایت اقبال کا فسانہ — غالب کی داستاں ہے میری زبان اردو
کیوں رشک اس کو آئے غیروں کے آستانے پر — خود رشک استاں ہے میری زبان اردو
دارورسن سے گذری زنداں میں دن گذارے — احرار کا نشاں ہے میری زبان اردو
دین و شعور میں جو یک انقلاب لائی — وہ مایۂ گراں ہے میری زبان اردو
یہ سنگ و خشت ہیں کیا روکیں گے راہ اس کی — یک سیل بے کراں ہے میری زبان اردو

(رضا جونپوری)

انسانی سماج میں ادب کا بڑا درجہ ہے جس میں اردو ادب کو خاص کر نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو دہلی کے قریب پیدا ہوئی اور دھیرے دھیرے پھلنے لگی۔ شروع میں اس کا نام ہند، ہندی، ہندوی اور دہلوی رہا۔ بعد میں یہ ہندی کے نام سے یاد کی گئی جب یہ دکن میں پہنچی تو اس کا نام اردو کا نام دکنی اور گجری ہوگیا۔ دہلی میں شاعری کی زبان کو ریختہ کہتے ہیں اور کبھی کبھی اردوئے معلیٰ بھی کہا گیا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں اس نے مستقل صورت اختیار کرلی۔

مگر اردو شعر و ادب کا باقاعدہ آغاز دکن میں شروع ہوا۔ اردو میں سیکڑوں کتابیں شاعری اور نثر میں لکھی گئیں قلی قطب شاہ جو کہ خود صاحب دیوان شاعر تھا اہل علم تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کا اکرام کرتا تھا۔ انعام وغیرہ بھی دلواتا تھا۔ قلی قطب شاہ کے خاندان میں تین اور بادشاہ گذرے جو شاعر بھی تھے۔ دکن کے تین ادیب وجہی ابن نشاطی اور غواصی بھی تھے۔ جنہوں نے قصے کہانیاں لکھیں بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے گیتوں کی ایک کتاب لکھی 'نورس' کے نام سے جس میں برج بھاشا اور شمالی ہند کے الفاظ شامل ہیں اورنگ زیب نے جب شمال اور جنوب پر قبضہ کرلیا۔ اسی دور میں اردو زبان کے شعر و ادب نے بڑی ترقی کی غزل مثنوی قصیدہ مرثیے کہانیاں اور مذہبی ادب بڑی تعداد میں شائع ہوا۔ اس دور میں داخل ہونے تک دکنی اردو ایک بڑی اور مضبوط زبان بن گئی تھی جس کا رسم الخط فارسی تھا۔ اس وقت تک اردو کو ہندی کہا جاتا تھا۔

اب دکن اور شمال دونوں مغل حکمرانوں کے قبضے میں آگئی۔ شاعروں نے فارسی چھوڑ کر اردو میں ہی لکھنا شروع کردیا۔

دکن کے مشہور شاعر ولی دکنی جن کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے غزل مثنوی اور نظم پر اپنی طبع آزمائی کی جب وہ دہلی آئے تو ان کی تقلید میں دہلی کے شعرا فارسی چھوڑ کر اردو میں شاعری کرنے لگے۔ ان کی شاعری میں سادگی کا عنصر خاص تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک ہد کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں باندھا ہے تیری لٹ سے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

ولی کے بعد دکن میں شعر وادب پر کام ہونے لگا۔ اور دہلی میں بیدل خان آرزو وغیرہ کے بعد فائز دہلوی، آبرو، یک رنگ، شاکر ناجی اور حاتم جیسے شاعروں نے اپنی جگہ بنائی۔ صوفیانہ شاعری زیادہ ہوتی تھی۔ اردو پر ابھی تک ہندی اور دیسی بولیوں کا اثر تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں اور حاتم نے ہندی کے ناگوار لفظ نکال کر اردو کی تراوخراش کی۔ درباری اور سرکاری زبان ابھی بھی فارسی تھی مگر اردو کو دھیرے دھیرے مقبولیت حاصل ہورہی تھی۔ مگر پھر بھی اردو شاعری کو ریختہ (گری پڑی چیز) کہا گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ دہلی پر احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ، مراٹھوں، جاٹوں، روہیلوں، سکھوں کے حملے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا دکن میں بنگال میں آزاد حکومت کا بول بالا ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب اردو نے ترقی کی مغلوں کی حکومت کمزور پڑنے سے فارسی کا غلبہ کم ہوگیا۔ دہلی کی شاعری میں ان حالات کا اثر پڑا میر تقی میر، سودا، درد، نظیر اکبر آبادی کے یہاں اس وقت کا منظر نامہ بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس وقت کے اہم شاعروں میں میر، سودا، میر درد، میر سوز قائم چاند پوری نے زیادہ تر غزلیں کہیں۔ سودا قصیدے کے بادشاہ کہلائے۔ میر تقی میر دہلی کے حالات پر ہجو لکھیں۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم نگاری میں کمال دکھایا۔ ان کی مشہور نظموں میں شہر آشوب، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ، روٹی نامہ، ہولی دیوالی، بلدیو جی کا میلہ اور گورو نانک بہت مشہور ہیں نظیر اکبر آبادی کی 'نظم بنجارہ نامہ' کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے بنجارہ

میر تقی میر کی غزلوں میں غم، افسردگی حزن وملال کا عکس ہے۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد وغم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

جب دہلی کے حالات حد درجہ بگڑ گئے۔ عمر تنگی کا احساس حد سے زیادہ ہونے لگا بیروزگاری بڑھی تو دہلی سے لکھنؤ کی طرف لوگوں نے ہجرت کی اس میں شاعر بھی شریک تھے۔ لکھنؤ میں اس وقت نواب شجاع الدولہ کی حکومت تھی ہر طرف امن وسکون تھا

خوشحالی تھی۔ میر تقی میرؔ، سوداؔ اور میر سوزؔ وغیرہ لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں شجاع الدولہ نے ان شاعروں کو خوب نوازا۔ اس وقت لکھنؤ میں مصحفی جرأت اور انشاء بھی دہلی سے لکھنؤ آ کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لکھنؤ کے ماحول میں خوشحالی عیش پرستی وغیرہ زیادہ تھی اس لیے وہاں کی شاعری بھی انہیں رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ انشاء اور مصحفی کے معرکے مشہور ہیں۔ انشا کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی اور قواعد کی کتاب دریائے لطافت نے مقبولیت حاصل کی۔ انشاء اور جرأت نے ریختی ایجاد کی۔ جس میں عورتوں کی طرف سے اکثر بہت اور فحش خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

دوسری طرف وہی دیا شنکر نسیم نے 'مثنوی گلزار نسیم' اور میر حسن نے مثنوی ''سحر البیان'' لکھی۔ جو لکھنؤ کی زندگی کی حقیقی تصویریں ہیں۔ میرزا شوقؔ کی مثنوی ''زہرہ عشق'' بھی اہم مقام کی حامل ہے۔ لکھنؤ میں آتش، ناسخ جیسے شاعر بھی تھے۔ جن کی شاعری سنجیدہ اور معیاری تھی۔ اسی دور میں میر انیس اور مرزا دبیرؔ نے مرثیہ جیسے فن کو اپنا کر اپنا لوہا منوایا۔

۱۸۲۵ء میں جب اردو سرکاری زبان بن گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ رام پور حیدر آباد فرخ آباد اور عظیم آباد (پٹنہ) وغیرہ شہروں میں اردو کے شاعر و ادیب یکجا ہو گئے دہلی میں اس وقت غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ کا چرچا تھا۔ غالب کی شاعری تھوڑی مشکل تھی مگر مومنؔ ذوقؔ کا کلام عام فہم تھا۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی شاعر تھے۔ دوسری طرف داغ اور امیر مینائی پرانے طرز کی شاعری کر رہے تھے۔ مگر موالانا حالی کی حقیقت پسند شاعری نے دوسری طرح رجوع کیا۔ حالیؔ مبالغہ آرائی اور لفاظی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں انجمن پنجاب قائم کی جہاں اردو نظموں کے مشاعرے ہوتے تھے۔ اکبر الہ آبادی اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے مشہور تھے۔ علامہ اقبال ایک قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ شبلی، ظفر علی خاں۔ محمد علی جوہر اور جوش ملیح آبادی وغیرہ نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ انگریزی حکومت کی بغاوت کی۔ فیض احمد فیضؔ، مخدومؔ محی الدین، ساحرؔ لدھیانوی، علی سردار جعفریؔ، مجازؔ، کیفیؔ اعظمی، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری، پریم دھون اور وامق جونپوری نے ترقی پسندی کو شاعری کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، اختر الایمان، احمد فراز، شاذؔ تمکنت، کمار پاشی، کلیم عاجز، اور معین احسن جذبی نے ۱۹۶۰ء کے بعد اردو میں شہرت پائی۔

ان کے بعد شہریار، وحید اختر نریش کمار شادؔ بلراج کومل، یگانہ چنگیزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو میں نظم گوئی کی ابتدا شرر، اسمٰعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد کے ذریعہ انیسویں صدی میں ہو چکی تھی ۱۹۳۰ء کے بعد آزاد نظم لکھنے والوں میں میرا جی، ن۔م۔ راشد، مختار صدیقی، سلام مچھلی شہری اور فیض احمد فیض کے نام شامل ہیں۔

اردو نثر کی ترقی شاعری کے بعد ہوئی۔ نثر کے پہلے نمونوں میں سید بندہ نواز گیسو دراز کے رسالے معراج العاشقین کو یاد کیا جاتا ہے۔ ملا وجہی کی سب رس، شمالی ہندوستان میں فضلی نے فارسی ترجمہ کر کے کربل کتھا لکھی۔ تحسین نے فارسی کے قصہ چہار درویش کو رنگین انداز میں نوطرز مرصع کے نام سے ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کے ترجمے بھی ہوئے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستانی زبان کی ترقی تھا۔ حکومت نے یہ ضروری سمجھا کہ زبان کی سرپرستی کر کے سرکاری ملازموں کو اردو زبان سے واقف کیا جائے تا کہ حکومت کے نظم و نسخ کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔ کالج کے بانی ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنے زمانے کے

مشہور و معروف ہندوستانی ادیبوں سے جو کتابیں لکھوائیں۔ ان میں بعض بہت مشہور ہوئیں۔ میر امّن نے فارسی کی چہار درویش'' کا اردو ترجمہ کیا باغ و بہار نام رکھا۔ میر شیر علی افسوس نے گلستان سعدی کا ترجمہ اردو میں آرائش محفل کے نام سے کیا۔ حیدر بخش حیدری نے قصہ حاتم طائی ،طوطا کہانی ،اور گلزار دانش لکھی۔ کاظم علی جوان نے کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ کیا اور سنگھاسن بتیسی کا قصہ اردو میں کیا۔ نہال چند لاہوری نے گل بکاؤلی کی کہانی نثر میں لکھی۔ اور اس کا نام مذہب عشق رکھا مظہر علی ولا نے بیتال لکھی۔ ان لوگوں کے علاوہ اکرام علی بہادر حسینی خلیل علی اشک، بنی نرائن جہاں، مرزا علی لطف اور للولال جی قابل ذکر ہیں۔

کالج سے الگ انشاء اللہ خاں کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی ، ملک گہر، دریائے لطافت، قواعد کی پہلی کتاب ہے۔ اس وقت ایک کتاب لکھنؤ کے رنگ میں لکھی گئی جو فسانۂ عجائب کے نام سے جس کے لکھنے والے رجب علی بیگ سرور تھے۔ پھر غالب' جو فارسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اردو میں خطوط لکھنے لگے۔ غالب کے خطوط کی یہ خوبی تھی کہ وہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیتے تھے۔ دوسرے نثر نگاروں میں ماسٹر رام چندر امام بخش صہبائی ، غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۸۵۷ء کے واقعے کے بعد ہندوستان میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں ہوئیں لہٰذا شعر و ادب بھی متاثر ہوا۔ سرسید تحریک وجود میں آئی ساتھ ساتھ جدید ادب بھی وجود میں آیا۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالؔی ، سرسید احمد خاں، مولانا نذیر احمد ، مولانا شبلی نعمانی۔ مولوی ذکاء اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے ادب نے اپنا پیرہن بدلا۔ نئی نئی ص ف کا اضافہ ہوا۔ جیسے ناول نگاری ، افسانہ نگاری، مضمون نگاری تنقیدی نگاری وغیرہ۔

سرسید کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ایک ادیب مصلح رہنما اور مفکر کی حیثیت سے انہوں نے جو بھی خدمات انجام دیں وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ ایک طرف سرسید کے اصلاحی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے تو دوسری طرف ان کی ادبی کاوشیں بھی اہمیت کی حامل ہیں ان کی ادب نوازی میں بھی اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر نظر آتا ہے۔ سرسید نے میر امّن اور مرزا غالب کی کوششوں میں اضافہ کیا۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

> '' جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہے وہی دوسروں کے دل پر پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''

سرسید کی تحریروں میں عام طور سادہ اور عام فہم لب ولہجہ ملتا ہے۔ سادگی اور سلاست کھردری یا سپاٹ ہیں شیرینی اور خلوص بھی ہے استدلالی اور منطقی عبارتیں بھی لکھیں۔ ان کا بنیادی مقصد قوم کی آبیاری تھا۔ تہذیب الاخلاق اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ ان کی تصانیف ہیں: آثار الصنادید، جلاء القلوب، تحفۂ حسن فوائد الافکار، قول متین، راہ سنت، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی بھی نئے ادب کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا سوچنا تھا کہ ہمیں زمانے کے ساتھ دین چاہیے۔ انہوں نے نثر میں کئی کتابیں لکھیں ۔ مثلاً حیات سعدی، یادگار غالب مقدمہ شعر و شاعری ، حیات جاوید وغیرہ مشہور ہیں وہ اول درجہ نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد بحیثیت ایک صاحب طرز انشا پرداز کے مشہور ہیں۔ آزاد کو زندہ رکھنے والا ان کا طرز تحریر ہے جس میں بلا

کی شوخی رنگینی سادگی اور پرکاری ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے تکلفی سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے ان مشہور کتابوں میں آب حیات دربار اکبری سخندان فارس نیرنگِ خیال اور قصصِ ہند قابل ذکر ہیں۔ ذکاء اللہ بھی بطور نثر نگار جانے جاتے ہیں۔مگر ان کو شہرت کم ملی۔

مولانا شبلی جنہیں نثر نویسی میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں سیرۃ النبی، شعرالعجم، الفاروق، المامون، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ اور علم الکلام ہے۔اس کے علاوہ خطوط کے مجموعے مضامین کے مجموعے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

سرسید تحریک کے زیر اثر نئے طرز کو اپنایا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول لکھنے شروع کیے یہیں سے ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ نذیر احمد کو انگریزی حکومت سے شمس العلما کا خطاب ملا قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ کئی قانونی کتاب کا بھی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ بچوں کے لیے'' چند پند'' منتخب الحکایات، مراۃ العروس، بنات النعش، کئی ادبی ناول توبۃ النصوح اور ابن الوقت بہت مشہور ہیں۔ سرشار اور شرر نے بھی ناول نگاری کی۔ سرشار کے ناولوں میں جام سرشار، سیر کہسار، خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ شررؔ کی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں ناول زیادہ ہیں۔ فردوس بریں، منصور موہنا، ایام عرب، زوال بغداد اور مقدس نازنین مشہور ہیں۔ ایک نام میرزا ہادی رسواؔ کا بھی جنہوں نے امراؤ جان ادا اور شریف زادہ جیسے ناول لکھے۔ خواجہ حسن نظامی کی تاریخی کہانیوں کو نظر انداز نہی کیا جاسکتا۔ راشد الخیری جنہیں مصور غم بھی کہا گیا۔ اس روایت کو آگے بڑھانے میں لگے رہے۔ ان کے ناولوں میں سمرنا کا چاند، صبح زندگی شام زندگی، ماہ عجم، محبوبہ حراوند، آمنہ کا لال، سراب مغرب وغیرہ مشہور ہیں۔ ایم۔سلیم، نسیم حجازی اور انیس احمد جعفری نے بھی ناول لکھے۔ نئی صدی کے لکھنے والوں میں سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات، عصمت چغتائی کی ضدی، تیڑھی لکیر، معصومہ وغیرہ علی عباس حسینی خواجہ احمد عباس اور صالحہ عابد حسین نے بھی ناول لکھے۔ قاضی عبدالغفار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پریم چند کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد خدیجہ مستور عبداللہ حسین اور قاضی عبدالستار کے نام نمایاں ہیں۔

نئی صدی کے افسانہ نگاروں میں نذر سجاد حیدر، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ ہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کی بنیاد پریم چند نے ڈالی اس سے قبل اردو میں مختصراً کہانیوں کا رواج تھا۔ پریم چند کے بعد نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری بھی افسانہ کی طرف مائل ہوئے۔ منصور احمد خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی اور دوسرے ادیبوں نے انگریزی کے معیاری افسانوں کے ترجمے کئے۔ سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کویوی، اوپندر ناتھ اشک بھی قابل ذکر ہیں۔ نذیر احمد سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، فضل الحق قریشی، اور عظیم بیگ چغتائی کا نام لیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے ان لوگوں نے افسانے کے معیار کو بلند کیا۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اس کے زیر اثر لکھنے والوں میں سید سجاد ظہیر، پریم چند، کرشن چندر، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر مجیب، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری۔ راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، غلام عباس قرۃ العین حیدر، رام لال، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈرامہ بھی اردو ادب کا ایک حصہ ہے ڈرامے کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ڈرامہ لکھنے والوں میں امانت علی، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، آغا حشر، مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے دیگر کارناموں کے علاوہ ایک ڈراما اکبر بھی شروع کیا۔ جسے بعد میں نذیر اور فراق نے مکمل کیا۔ رسواؔ

نے بھی ڈرامہ مرقع لیلیٰ مجنوں لکھا۔ علی خاں، عبدالماجد دریا آبادی، کازود پشیماں، پنڈت کیفی کا راج دلاری، مداری دادا، عبدالحلیم شرر، پریم چند، چکبست نے ڈرامے لکھے۔ اس فن میں سب سے زیادہ کامیابی امتیاز علی تاج، اور سید عابد حسین کو ملی۔ تاج کا ڈرامہ، انارکلی اور عابد حسین کا 'پردہ غفلت' قابل ذکر ہے۔ اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمٰن، بعد میں منٹو نے '' منٹو کے ڈرامے'' اور' جنازے' ڈراموں کا مجموعہ ہیں۔ کرشن چندر کے ڈراموں کا مجموعہ '' دروازہ'' قابل ذکر ہے۔ مرزا ادیب کے ڈراموں کے تین مجموعے، لہو اور قالین، آنسو اور ستارے اور پس پردہ، قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر ڈرامہ نگاروں میں عصمت، جاوید اقبال ڈاکٹر محمد حسین نے بھی ڈرامے لکھے ان کے ڈراموں میں رومانیت اور حقیقت پسندی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان ڈرامہ نگارون کے علاوہ اوپندر ناتھ، حبیب تنویر ریوتی سرن شرما، کرتار سنگھ دگل، اور ابراہیم یوسف قابل ذکر ہیں۔

طنز و مزاح بھی ادب کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کے لکھنے والوں شوکت تھانوی، پطرس، ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی رشید احمد صدیقی، فکر تونسوی، ابن انشاء، فرقت کاکوروی، مجتبیٰ حسین، جمیر جعفری، مشتاق احمد، یوسفی، کنہیا لال کپور شفیق الرحمٰن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تنقید نگاری میں مولانا آزاد، حالی، شبلی، کے علاوہ احتشام حسین، سجاد ظہیر، احمد سرور، محی الدین قادری زور کلیم الدین احمد، وزیر آغا، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، سید عقیل رضوی، وارث علوی، اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام خاص ہیں۔

تحقیق کے میدان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی، کالی داس گپتا رضا اور رشید حسن خاں کے نام اہم ہیں۔

فلسفیانہ علمی اور عالمانہ نثر پر بھی کام ہوا فلسفہ، تاریخ و تمدن وغیرہ کی طرف بھی ہمارے لکھنے والوں نے توجہ کی ان میں ذاکر حسین عابد حسین غلام السیدین، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریا آبادی، ظفر حسین خاں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

وقت کے ساتھ ادب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے نئی نئی چیزیں شامل ہو رہی ہیں مثلاً شاعری اور افسانوں میں علامت نگاری، بیانیہ انداز تنقید کے میدان میں نئے رجحانات دکھائی پڑتے ہیں۔ لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے اردو ادب روز بروز ترقی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

☆☆

ڈاکٹر خدیجہ ظاہرہ

اردو نثر

ادب اور زندگی کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے اور اردو نثر ادب کی ایک خاص صنف ہے اس لیے اردو نثر شاعری ہی کی طرح انسانی معاشرے سے قریب ہے۔ حالانکہ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہر زبان میں نثر کا ارتقاء شاعری کے بعد میں ہوا ابتدا میں انسانی زندگی میں ایک قسم کی بے ربطی تھی۔ اس لیے ان کی زبان میں بھی نکھار پیدا نہ ہوسکا۔ مگر جیسے جیسے انسانی دماغ نے ترقی کی اس نے اپنی زندگی کی بہتر سے بہتر انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس طرز زندگی کے اظہار کے لیے زبان کو پیش کر ناگزیز تھا۔

ابتدائی نثر کے نمونے سکوں، مٹی کے برتنوں، پتھروں، درخت کی چھالوں پر دکھائی دیتے ہیں جو بعد میں بولی کی شکل رونما ہوئے۔ اس پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ہے۔ حد ضروری ہے کہ نثر سے مراد کیا ہے۔ ٹی شیلے نے نثر کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ عام طرز گفتار یا تحریر ہے جو شاعری سے مختلف ہو۔''

انسائیکلوپیڈیا برٹنکا میں نثر کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

''نثر بنی نوع انسان کی وہ عام گفتگو کو کہتے ہیں جو بہت ہی سادہ ہو اور نظم کے قواعد وضوابط سے مبرا ہو ادبی اصطلاح کے طور پر یہ نظم سے مختلف ہے اور اس کی ضد ہے چونکہ شاعری کی تعریف کے بعد مابعد الطبیعاتی مضمرات ہیں اسی وجہ سے ادبی نثر بہترین ذریعہ اظہار ہے یہ لاطینی لفظ پروز (ابتدائی پروز) سے مشتق ہے جس کا مفہوم راست اور بلا واسطہ ہے اس لیے بعض اشخاص کا نظریہ ہے کہ نثر کو سیدھی سادی زبان میں ہونا چاہیے جس سے زبان کی سچائی یا ثبوت واقعتاً یا عقلاً ظاہر ہو۔''

☆

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ہی اردو زبان میں بھی نثر کا ارتقا بعد میں ہوا۔ وجہ شاید یہی رہی ہو کہ لوگ شاعری کی طرف جلد رجوع ہو جاتے ہیں ۔ وہ دور جب دکن میں اردو نثر نظر آئی یا شروع ہوئی اس وقت سید بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین کو یاد کیا جاتا ہے یہ رسالہ جو تصوف کے بارے میں تھا یہی نثر کا پہلا نمونہ کہلایا ۔ تبلیغی موضوع پر لکھا گیا تھا۔ دیگر وہ لوگ جن کا شمار انہیں لوگوں میں ہوتا ہے ۔ میران جی شمس العشاق ، اور برہان الدین حاتم، کا نام آتا ہے انہوں نے بھی نثر اور نظم دونوں میں لکھا تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلم نے نثر کے کچھ رسالے ملتے ہیں جو سید گیسو دراز کے پہلے کے ہیں بعد میں سید مخدوم اشرف جہانگیر کچھوچھوی نے ایک مذہبی رسالہ لکھا مگر ثبوت نہیں ہے۔ ان نثری نمونوں کو ادبی درجہ نہیں ملا ہے۔ مگر ملا وجہی کی '' سب رس'' کو ادبی نثر کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ بعد میں محمد قادری کی '' طوطی نامہ'' ہے جس میں اخلاقی کہانیاں ہیں ۔

شمالی ہندوستان میں اردو نثر کا ارتقا جنوبی ہند کے بعد ہوا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں پر مغلوں کی حکومت تھی ان کی زبان فارسی تھی۔ بہت عرصہ کے بعد اردو زبان کو اپنایا۔ اس کے بعد ہی اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ محمد شاہ کی سلطنت کے زوال کے بعد فارسی اثرات کم ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت کی سب سے اہم تصنیف فضلی کی کربل کتھا ہے۔ اس کتاب میں اسلامی واقعات کا ذکر ملتا ہے ۔ پھر ایک لمبے وقفے یعنی ۴۵ سال کے بعد میر حسین عطا تحسین کی کتاب نوطرز مرقع ہے جس کا ترجمہ فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے چار درویشوں کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن شریف کے دو ترجمے ہوئے ان فارسی کی جگہ اردو نے لینی شروع کر دی تھی۔

انگریزوں نے اپنے پیر پھیلانے شروع کر دیئے تھے کہ کئی جگہ قابض ہو چکے تھے ۔ اودھ ان کے قبضے میں تھا۔ چونکہ وہ اردو زبان سے واقف نہیں تھے اس لیے انہوں نے اردو زبان سیکھی لہٰذا فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانی زبان کی ترقی تھا۔ حکومت نے یہ ضروری سمجھا کہ اس زبان کی سرپرستی کر کے سرکاری ملازموں کو اردو زبان سے واقف کیا جائے تا کہ وہ حکومت کے نظم ونسق کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج انیسویں صدی میں قائم کیا گیا۔ اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے انہوں نے اردو کی ترقی کے لیے بہت کوشش کی فورٹ ولیم کالج میں تعلیم پانے والے انگریز عہدے داروں کے لیے گلکرسٹ نے اپنے زمانے کے مشہور ومعروف ہندوستانی ادیبوں سے جو کتابیں لکھوائیں ان میں بعض بہت مشہور ہوئیں۔ نثر نگاری کا واضح معیار بھی قائم ہوا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ خود بھی بہت قابل تھے انہوں نے ملک کے بہترین نامور ادیبوں کو اٹھا کر کے ایسی کتابیں لکھوائیں جو عام فہم اور دلچسپ ہوں رنگین عبارت اور مشکل طرز تحریر سے گریز کیا۔ بلکہ سلیس اور رواں عبارت پر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو

بہت جلد عام فہم اور دلکش نظر آنے لگی تھوڑے ہی دنوں میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انسان دوستی اور ادب نوازی کا نتیجہ تھا جو میر امن نے فارسی کی ''چہار درویش'' کا اردو ترجمہ کیا اور ''باغ و بہار'' نام رکھا۔ اس تصنیف کو اعلیٰ مقام حاصل ہے اس کی مقبولیت میں میر امن کی سادہ سلیس اور دلچسپ زبان کا بڑا دخل ہے۔ عربی فارسی الفاظ کی جگہ ہندی اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے میر امن جدید نثر کے بانی بھی ہیں۔

میر شیر علی افسوس نے بھی کالج کی تعلیفات میں ''گلستان سعدی'' کا ترجمہ اردو میں آرائش محفل کے نام سے کیا تھا۔ حیدر بخش حیدری نے قصہ حاتم طائی ،طوطا کہانی اور گلزار دانش لکھی۔ کاظم علی جوان نے کالی داس کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ کیا اور سنگھاسن بتیسی کا قصہ اردو میں لکھا۔ نہال چندر لاہوری نے گل بکاؤلی کی کہانی نثر میں لکھی۔ اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔ مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی۔ ان لوگوں کے علاوہ اکرام علی، بہادر حسینی، خلیل علی اشک، بینی نرائن جہاں، مرزا علی لطف اور للو لال جی نے قابل ذکر ہیں۔

فورٹ ولیم کالج سے الگ بھی لکھنے کا کام جاری تھا۔ انشااللہ خاں نے اردو میں رانی کیتکی کی کہانی اور کنور اودے بھان کے نام سے لکھی۔ ایک اور کہانی لکھی۔ سلک گہر کے نام سے اس کے علاوہ ان کی کتاب دریائے لطافت ہے یہ اردو قواعد کی پہلی کتاب۔ اس وقت ایک کتاب لکھنؤ کے رنگ میں لکھی گئی جو فسانۂ عجائب کے نام سے لکھی ہے جس کے لکھنے والے رجب علی بیگ سرور تھے۔

سرور نے فسانہ عجائب لکھ کر قدیم طرز نگارش کو پھر سے زندہ کردیا سرور نے یوں تو اردو نثر میں کتابیں لکھیں مثلاً سرور سلطانی، گلزار سرور، انشائے سرور اور شگوفہ محبت لیکن ان سب میں فسانہ عجائب کو دبستان لکھنؤ کا پہلا قابل قدر نثری کارنامہ تصور کیا گیا۔ ۱۸۲۵ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا۔ پریس قائم ہوئے صحافت کے میدان میں بھی کام ہوا۔ اخبار نکلنے لگے اسی زمانے میں دلی کالج کا قیام بھی عمل آیا۔ نثر کی ترقی کا سنہرا دور بھی یہی تھا۔ غالب کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب سے پہلے اردو نثر پر فارسی کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ خطوط نگاری میں بھی فارسیت کا غلبہ تھا، لمبے لمبے القاب ہوتے مدعا یا راز کی باتیں اشارے کنائے میں لکھے جاتے تھے لیکن غالب نے اپنا پیرایہ بیان بدلا اور ایسی راہ نکالی جس کے وہ خود موجد بن گئے یعنی وہ انداز اختیار کیا کہ گویا دو لوگ دور ہوتے ہوئے بھی لگتا ہے بہت قریب ہیں اور آپس میں محو گفتگو ہیں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں شگفتگی کا بہت لحاظ رکھا۔ غالب کی ظرافت اور بزلہ سنجی نے خطوط پر گہرے نقوش مرتب کئے۔ چاہے خیریت نامہ ہو یا غم و الم کی داستان ہو یا پھر کوئی تعزیتی خط ہو ان کی شگفتہ تحریریں اپنے آپ میں بے مثل ہیں۔ غالب کے یہ خطوط نہ صرف سلیس اور رواں نثر کے نمونے ہیں بلکہ اردو ادب میں طنز و ظرافت کے میدان میں بھی خطوط غالب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ غالب کے خطوط آدھی ملاقات ضرور کرادیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دو لوگ آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کررہے ہیں۔ ان کا قول خود پر صادق ہوگیا۔ 'میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا' خطوط غالب کے دو مجموعہ ''عود ہندی'' ''اور اردوئے معلیٰ'' اردو ادب کے جواہر پارے ہیں۔

دوسرے نثر نگاروں میں ماسٹر رام چندر امام بخش صہبائی، غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں اردو نثر اب قدم جما چکی تھی حالات کے ساتھ ساتھ مزید ترقی کی طرف گامزن تھی۔

۱۸۵۷ء کے واقعے کے بعد ہندوستان میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں ہوئیں لہٰذا ہندوستانی سماج میں شعر و ادب میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کی مذہبی تحریک سرسید تحریک وغیرہ وجود میں آئیں۔ اور ساتھ ساتھ جدید اردو ادب بھی وجود میں آیا۔ مولانا محمد حسین آزاد مولانا حالی سرسید احمد خاں، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی مولوی ذکا اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس نئے دور میں جہاں اردو شاعری نے اپنا رنگ و آہنگ بدلا وہیں نثر میں نئی نئی صنف کا اضافہ ہوا۔ ناول نگاری تنقید نگاری، مضمون نگاری وغیرہ کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ سرسید کا دور بھی یہی ہے۔ سرسید کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ایک ادیب مصلح رہنما اور مفکر کی حیثیت سے انہوں نے جو بھی خدمات انجام دیں وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ ایک طرف سرسید کے اصلاحی کاناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے تو دوسری طرف ان کی ادبی کاوشیں بھی اہمیت کا حامل ہیں ان کی ادب نوازی میں بھی اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے سرسید نے میر امّن اور مرزا غالب کی ادبی کوششوں میں اضافہ کیا کیوں کہ انہوں نے اپنے بارے میں خود لکھا ہے۔

"جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کے ادا میں موجود اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے
دل پر پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔"

سرسید کی تحریروں میں عام طور پر سادہ اور عام فہم لب ولہجہ ملتا ہے۔ سادگی اور سلاست کھردری یا سپاٹ ہیں شیرینی اور خلوص بھی ہے استدلال اور منطقی عبارتیں بھی لکھیں۔ ان کا بنیادی مقصد قوم کی آبیاری تھا۔ پرچہ تہذیب الاخلاق کو اس سلسلے کی اہم کڑی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں آثار الصنادید، جلاء القلوب، تحفۂ حسن، فوائد الافکار، قول متین، راہ سنت، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی بھی ادب کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا سوچنا تھا کہ ہمیں زمانے کا ساتھ دینا چاہیے انہوں نے نثر کی کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً حیات سعدی یادگار غالب، مقدمہ شعر و شاعری، حیات جاوید وغیرہ مشہور ہیں۔ وہ اول درجہ کے نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد بحیثیت ایک صاحب طرز انشا پرداز کے لیے مشہور ہیں آزاد کو زندہ جاوید رکھنے والا ان کا طرز تحریر ہے۔ جس میں بلا کی شوخی رنگینی سادگی اور پرکاری ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے تکلفی سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں آب حیات، دربارِ اکبری، سخندان فارس نیرنگ خیال اور قصص ہند قابل ذکر ہیں۔ ذکاء اللہ بھی بطور نثر نگار جانے جاتے ہیں مگر ان کو شہرت کم ملی نذیر احمد کا مرتبہ بڑا ہے انگریزی حکومت سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ قرآن شریف کا ترجمہ کیا۔ کئی قانونی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا بچوں کے لیے چند پند، منتخب الحکایات، مراۃ العروس، بنات النعش کئی ادبی ناول۔ توبۃ النصوح اور ابن الوقت بہت مشہور ہیں۔

مولانا شبلی جن کو نثر نویسی کی حیثیت سے ادیبوں میں اہم مقام دیا گیا۔ ان کی مشہور کتابوں میں سیرت النبی، شعر العجم، الفاروق، المامون، موازنہ انیس و دبیر اور علم الکلام ہیں۔ ان کے علاوہ خطوط کے مجموعہ مضامین کے مجموعے بھی قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے اہم لوگوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، شرر سرشار کے ناول، جام سرشار، سیر کہسار خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ شرر کے کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان میں ناول زیادہ ہیں۔ فردوس بریں، منصور موہنا، ایام عرب، زوال بغداد، اور مقدس نازنین وغیرہ

کتابیں مشہور ہیں۔ ایک نام رسوا کا بھی ہے جنہوں نے ناول امراؤ جان ادا اور شریف زادہ جیسے ناول لکھے۔ خواجہ حسن نظامی کی تاریخی کہانیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ راشد الخیری جنہیں مصور غم کہا جاتا ہے اس روایت کو آگے بڑھانے میں لگے رہے۔ نئی صدی کے لکھنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر، پریم چند قابل ذکر ہیں۔ پریم چند کو سب میں برتری حاصل ہے جن کے افسانے اور ناول مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ سجاد ظہیر کے افسانوں کا مجموعہ انگارے بھی قابل ذکر ہے۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا یہ تحریک ہندوستان کی سبھی زبانوں میں مقبول ہوئی۔ اس کے زیر اثر لکھنے والوں میں کرشن چندر عصمت، منٹو، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، عزیز احمد، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد کے ادیبوں میں قرۃ العین حیدر رام لعل جیلانی بانو قاضی عبدالستار وغیرہ۔

طنز و مزاح کی طرف لوگوں نے نظر کی۔ پطرس ملا رموزی عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی فکر تونسوی ابن انشا، فرقت کاکوری، مجتبیٰ حسین، ضمیر جعفری، مشتاق احمد یوسفی، کنہیا لال کپور شفیق الرحمٰن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

تنقید نگاری میں مولانا آزاد، مولانا حالی اور شبلی کے علاوہ احتشام حسین، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، محی الدین قادری زور، کلیم الدین احمد، وزیر آغا، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید عقیل رضوی، وارث علوی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سرفہرست ہیں۔ تحقیق کے میدان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، ڈاکٹر جمیل جالبی، کالی داس گپتا رضا، اور رشید حسن خاں کے نام آتے ہیں۔

ڈرامہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں آغا حشر کاشمیری، امتیاز علی تاج، پروفیسر مجیب عابد حسین، منٹو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رفیع پیر، ابراہیم یوسف ڈاکٹر محمد حسن۔

وقت کی مانگ کے ساتھ ادب کی روایتیں بدلتی رہتی ہیں بہت سی نئی نئی چیزیں بھی شامل ہیں جیسے علامت نگاری، بیانیہ افسانے اور تنقید میں بھی نئے رجحانات دیکھے جاتے ہیں۔ آج بھی اردو نثر میں روز بروز نئی نئی چیزیں شامل ہوتی جا رہی ہیں اور وہ ترقی کی طرف گامزن ہیں۔

☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

مولانا الطاف حسین حالی

الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لیے ابتدائی تعلیم میں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع میں سید جعفر علی اور ابراہیم حسین سے فیض حاصل کیا۔ تلاش معاش کا سلسلہ انہیں دہلی لے گیا۔ جہاں انہیں مصطفٰے خاں شیفتہؔ کی صحبت ملی۔ جو علم شناس اور اچھے شاعر بھی تھے۔ جس کا خاطر خواہ اثر حالیؔ کی شخصیت پر پڑا وہ بھی شعر کہنے کی طرف راغب ہوگئے۔ اور یہی سلسلہ ہے جس نے انہیں غالبؔ کا شاگرد بنایا۔

ملازمت کے سلسلے میں لاہور گئے۔ جہاں ان کی ملاقات محمد حسین آزاد سے ہوئی۔ آزاد کی وجہ سے ہی ان کا جدید شاعری کی طرف رجحان بڑھا۔ دہلی، حیدر آباد میں ملازمت بھی کی مگر زیادہ دن یہ سلسلہ نہ چلا سکا آخر میں پانی پت میں ہی سکونت اختیار اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں انتقال کیا۔

اردو ادب کی تاریخ میں حالیؔ کو کئی حیثیتوں سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ جہاں ایک طرف انہوں نے شاعری کو نئی جہت سے آشنا کرنے کی کامیاب کوشش کی دوسری طرف دیکھا جائے تو ان کی ادبی خدمات کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نثر نگار، تنقید نگار محقق سوانح نگار جیسی اہم خوبیوں کے مالک ہیں۔ حالیؔ کو زبردست شہرت اور مقبولیت دلانے میں ان کی وہ سوانح عمریاں ہیں۔ پہلی سوانح عمری انہوں نے حکیم ناصر خسرو کی حالات زندگی پر لکھی، پھری حیات سعدی، یادگار غالبؔ جو اپنے استاد مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی زندگی کے بارے میں تھی۔

'حیات جاوید' جس میں سر سید احمد خاں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ حالیؔ کا اردو نثر میں ''ایک اور اہم کارنامہ'' مقدمہ شعروشاعری'' ہے، جو ان کا ایک اعلیٰ تنقیدی کارنامہ بھی ہے۔ انہوں ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر اردو نثر میں سنجیدہ اور علمی تنقیدی راہ دکھائی ہے۔ حالیؔ سے پہلے اردو شاعری پر تفصیلی تنقیدی جائزہ نہیں ملتا۔ اس مقدمہ میں حالیؔ

نے اردو شاعری کے تمام اصناف کا جائزہ لیا ہے اور اس میں اصلاح و ترمیم کے لیے دعوت دی ہے اور وہ چیزیں جو اردو شعر و ادب کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نظر آئی اس کی طرف انہوں نے بڑی بیباکی سے اشارہ بھی کیا ہے۔ مثلاً غزل کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس کا دائرہ محدود ہوگیا ہے۔ شاعر احساس جمال کے علاوہ محبوب کے لباس اور دوسرے لوازمات کا ذکر اپنی شاعری میں کرنے لگے ہیں جس سے غزل حقیقت پسندی سے دور ہوتی جارہی ہے۔ قافیہ پیمائی کا رواج زیادہ ہوگیا ہے شاعر یہ سوچتا ہے غزل صرف گل و بلبل کا ذکر و حسن کی تصویر کشی ہے اور وہ اسی کو اپنی دنیا سمجھ بیٹھا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے شاید وہ نہیں جانتا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

حالؔی کا اسلوب ان کی ادبی زندگی کا ضامن ہے۔ ان کے اسلوب میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز ان کا غیر شخصی رنگ ہے کیونکہ وہ اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت کو بے نقاب نہیں کرتے۔ بیانیہ تحریروں میں وہ ایک دیانت دار واقعہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہیں ان کے مزاج میں سادگی انکساری خلوص اور شفقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی حقیقت نگاری ہر جگہ کارفرما ہے اس وجہ سے ان کی تحریروں میں رنگینی اور دلچسپی کے عناصر کم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حقیقت نگاری کے اصول کیا ہیں انشاء پرداز کو اپنے مقصد سے ذرہ برابر ہٹنا نہیں چاہئے انہوں نے مدعا نگاری کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

حالؔی نے اپنی تحریروں کو شدت جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا۔ اپنے مفہوم کو نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعرانہ تخیل بھی ہے جس نے ان کی نثر میں ادبی حسن اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے ان کی خالص معلومات اور بیانیہ تحریروں میں خشکی پیدا نہیں ہونے پاتی یہ لطف انگیزی ان کا ادبی رنگ ہے۔ اپنی تحریروں میں منطق اور تخیل کی مدد سے جوش پیدا کرنا چاہتے ہیں وہاں تحریروں میں زور پیدا ہو جاتا ہے اس کے لیے وہ تشبیہات و استعارات اور تمثیلات کا سہارا لیتے ہیں جہاں تشبیہات ان کے بیان میں لطف پیدا کرتی ہیں وہاں مفہوم کو اور بھی واضح بنا دیتی ہیں۔ استعارات کا کم استعمال ہے مگر جتنے بھی ہیں وہ بیان کی وضاحت میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

حالؔی کی تحریروں میں سادگی ہے۔ ان کے نزدیک مضمون خواہ کتنا ہی بڑا اور پیچیدہ ہو مگر اس میں ناہمواری نہیں ہونی چاہئے۔ خیال اور طرز ادا میں بھی سادگی ہونی چاہئے۔ وہ اپنے مضمون کو وضاحت سے پیش کرنا سب سے بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان عام فہم ہوتی ہے۔ بیان میں بے ساختگی اور بے تعلقی ہوتی ہے۔ بیان کو سادہ بنانے کے لیے عبارت اور فقرے طویل ہو جاتے ہیں۔ حالؔی کو اپنے عہد کا سب سے بڑا مدعا نگار بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جس

موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس میں بہت سنجیدگی اور متانت ہے اس کا عکس ان کی تحریروں میں جانچنا نظر کو رواج دیا۔ جس میں کہیں بھی تصنع کا نام نہیں یہ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر بحث کرتے وقت ان کی اکثر تحریروں میں یکسانیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ حالؔی ہندی عربی، فارسی اور انگریزی کے مشکل الفاظ اپنی تحروں میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ غیر زبان کے الفاظ کو ہندوستان کی عام زبان میں شامل کرنا اور رائج کرنا زندہ زبان کے لیے اشد ضروری ہے۔ حالؔی سوانح عمریوں میں بھی جو انداز بیان اٹھایا ہے وہ اس طرح کا ہے جو ان کے دیگر نثری کارناموں میں ملتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری مغربی ادب کے زیر اثر وجود میں آئی۔اردو میں باضابطہ آغاز انیسویں صدی کے اخیر سے ہوتا ہے۔ سوانح حیات ہم اس تصنیف کو کہیں گے جس میں کسی ایک شخص کی زندگی کے واقعات مفصل بیان کیے گئے جس کی بنیاد جذبات اور احساسات پر مبنی ہوں۔ ارسطو نے ایک معیار بنایا۔وہ یہ ہے کہ ''حیات سنجیدہ ہو مکمل ہو اور کچھ عظمت کی حامل ہو''۔

جب ہم حالؔی کی سوانح نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی اردو میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے سوانح نگاری کے اصول و ضابطوں کو سمجھا مغرب میں لکھی گئی سوانح عمریوں کے معیار کے اصول کو سمجھ کر اردو میں معیاری سوانح نگاری کی راہیں ہموار کیں۔ سرسید نے ''سیرت فریدیہ'' سوانح عمری کی شروعات کی۔حالؔی نے انہیں نقوش میں مزید رنگ آمیزی کی۔حالؔی نے خود لکھا ''بائیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے''۔ اور بھی واضح الفاظ میں'' بائیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے کام کرو''۔

ویسے تو حالؔی کے سوانحی کردار سعدی، غالبؔ اور سرسید جیسی شہرہ آفاق ہستیاں ہیں۔مگر ان میں یادگار غالبؔ سب سے مقبول ومعروف ہے۔ ادبی لحاظ سے یادگار غالبؔ کو دوسری سوانح عمریوں کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملی۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں۔'' سوانح عمریوں میں(یادگار غالبؔ کے سوا) ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے معیاری سوانح عمری کہا جاسکتا ہو''۔

حالؔی غالبؔ کے شاگرد تھے۔ غالبؔ کی صحبت میں رہے فیض حاصل کیا۔ اس لئے عقیدت اور احترام بھی تھا جو سوانح نگار کے لئے ضروری ہے۔ کس طرح سے حالؔی نے غالبؔ کے حالات معلوم کئے اس کے بارے میں خود لکھا ہے:

''میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور

اخلاق وعادات کا سراغ ملا قلم بند کیا۔ جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا"۔

یادگار غالبؔ حالیؔ کی عقیدت مندی اور خلوص کی بھی آئینہ دار ہے۔انھوں نے دیباچہ میں لکھا ہے" علی الخصوص مرزا اسداللہ خاں غالبؔ جن کی عظمت وشان اس سے بالا تر تھی کہ ان کو بارہویں صدی یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشاپردازوں میں شمار کیا جائے۔"

حالیؔ کو غالبؔ کی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ یادگار غالبؔ کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں غالب کی زندگی کے واقعات اور ان کے اخلاق وعادات کا ذکر ہے دوسرے حصے میں غالب کی شاعری پر تنقید وتبصرہ ہے۔

مولانا حالیؔ نے بڑی محنت سے جانفشانی سے غالبؔ کی زندگی کے واقعات کو یکجا کیا جس میں غالبؔ کے سفر کلکتہ کا بھی ذکر ہے۔ غالبؔ کے اخلاق وعادات کے بارے میں ان کی دوست نوازی مروت ظرافت، خود داری حق پسندی کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ حالیؔ کے قلم اٹھانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ بہرحال یادگار غالبؔ حالیؔ کی فن سوانح نگاری کا بہترین نمونہ ہے سید عبداللہ نے لکھا ہے:

"اردو میں سوانح نگاری بہت سے اہل قلم نے کی مگر ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس سوانح نگار کا دل ہو سوانح نگار کا دل صرف حالیؔ کے حصہ میں آیا ہے"۔

اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں "یادگار غالبؔ" کو وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی سوانح عمریوں میں بوسول کی حیات جانسن کو ہے۔

ڈاکٹر نسرین رئیس خان

غالب کی شاعری

حالی نے غالب کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے بنیادی بات یہ کہی ہے کہ شروع سے لے کر میر و مرزا کے زمانے تک اردو غزل کا یہ مزاج اور معیار رہا ہے کہ اس میں بیشتر عاشقانہ مضامین بعد وہ بھی روایتی انداز سے پیرایہ غزل میں پیش کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں وہ صورت ہے جس کو ہم بدیع السلوبی کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ مرزا کے یہاں یہ مضامین صرف نئے ڈھنگ سے نہیں آتے سوچ کا انداز بدلا ہے۔ انھوں نے عشق عاشقی کا معاملہ کہیں کہیں ضرور روایتی انداز سے پیش کیا ہے۔ ورنہ اکثر ان کی رائے ان کا خیال اور ان کا تجربہ دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ غالب کے یہاں حسن و عشق کا تصور بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ عشق میں نہ عاجزی کے قائل ہیں اور نہ انکساری کے کبھی کبھی نرم لہجے میں بات ضرور کرتے ہیں۔ لیکن وہ حسن و عشق کے ساتھ مسائل کو تہذیب زندگی اور شعور جمالیات سے متعلق کر کے دیکھتے ہیں۔

انھوں نے اپنے خطوط میں بھی کئی بار اس کا ذکر کیا ہے۔ کہ اگر عشق ہی کرنا ہے۔ تو کی مکھی بنو۔ شہید مکھی نہیں۔ لیکن اس سے مطلب بے وفائی نہیں ہر جائی پن نہیں۔ ان کی مراد صرف یہ ہے کہ حسن تو ہر جگہ ملتا ہے اس کو وہاں Apriciate کرو اس کی تعریف و تحسین کرو۔ اسی لیے حسن سے لذت اندوزی اور لطف آفرین ان کو زیادہ پسند ہے۔ اور بدن کا تذکرہ ان کے یہاں کم ہے۔ یہ فارسی شاعری اور اس کی جمالیات کا بھی اثر ہوسکتا ہے۔

حالی نے آگے چل کر یہ کہا ہے کہ غالب کے پیش رو شاعر ایک ہی لکیر یا لیک پر چلتے رہے۔ اس سے انہوں نے بال برابر انحراف نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ حالی کی اس رائے سے کلیتاً اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ سرِ مو انحراف کرتے تو ایک شاعر کی شاعری دوسرے شاعر سے مختلف کیسے ہوتی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ مرزا کے یہاں حال اور خیال سے متعلق مضامین کا انداز بدلا ہوا ہے۔ حالی نے خود بھی اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

''مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم

دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا
ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک نئی نرالی کیفیت مشاہد کرتا
ہے اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے''

حالی نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے غالب کے کچھ ایسے شعر بھی پیش کیے ہیں جن میں نیا مضمون پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً:

بس کہ مشکل ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کے زمانے میں شاعری میں ایک خاص طرح کے منطقی استدلال سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی شاعر اپنی طرف سے کسی بات کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور پھر اس کے لیے شاعرانہ دلیل پیش کرتا تھا۔ اس شعر میں دعویٰ یہ ہے کہ ہر کام کا آسان ہونا بہت مشکل ہے۔ مشکل اور آسان میں صنعت تضاد موجود ہے۔ بہر حال اس دعوے دلیل غالب نے یہ فراہم کی کہ آدمی کا آدمی بننا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن آدمی کا انسان بننا ہی تو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس سلسلے میں حالی نے ایک اور شعر پیش کیا ہے۔ جو اس سے زیادہ پر کشش ہے۔

یہ شعر جس میں نشاط کار جیسی خوبصورت ترکیب بھی آئی ہے۔ جو معنی خیز ہے اس لیے کہ کام کے شوق اور امنگ کو اگر کام سے وابستہ نہ کیا جائے۔ تو وہ بے حد غیر دلچسپ تھک تکلیف دہ اور اکتا دینے والا عمل ہوتا ہے ہوس کے معنی ہیں شدید خواہش جینے کی شدید خواہش ہی نے تو ہر کام میں دلچسپی اور کشش کا پہلو پیدا کیا ہے۔ اگر موت نہ ہو اور زندگی کی یہ ساری دلچسپیاں وقتی نہ ہوں لحاتی نہ ہوں، تو پھر خود زندگی ایک اکتا دینے والی بات بن جاتی ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ آخر یہ زندگی ہے کیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کے یہاں بہت معاملات میں سوالیہ نشان موجود ہیں۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں تشکیک پسند ہیں۔ یعنی جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے وہ اس پر سوالیہ نشان لگا لیتے ہیں۔ کہ ایسا کیوں ہے۔ یہاں ان کا منطقی سائنٹیفک مزاج اپنا اثر ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔ تصوف اور خود فلسفہ میں یہ اہم مسائل موجود ہیں کہ انسان خود ذات حق کا حصہ ہے۔ اس کا اپنا وجود اگر الگ سے کچھ نہ ہو تو وہ حقیقی وجود سے الگ نہیں ہے۔ غالب نے اسی بات تو اس شعر میں بھر پور انداز سے پیش کیا ہے۔ بقول حالی بالکل نئی طرح سے نیتی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ قطرہ اسی وقت تو ایک وجود حقیر ہوتا ہے جب وہ سمندر سے باہر آتا ہے۔ اگر سمندر میں رہے تو پھر وہ سمندر ہی کا حصہ ہے۔ اور سمندر کی طرح لافانی ہے۔ اس لیے پیدا ہونا فائدہ کے بجائے نقصان کا سبب ہوا۔ اسی کو تو غالب نے ڈبونا کہا ہے کہ

مجھکو تو ہونے نے ڈبو دیا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

حالؔی نے اس پر اپنا Comment دیتے ہوئے کہا ہے۔''بالکل اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت عمدگی اور صفائی سے ادا کیا گیا'' غالب نے بڑی خوبصورتی سے یہ بات کہی ہے کہ ہمت اور حوصلہ ہی سے بڑائی اچھائی کی اور سچائی ملتی ہے۔ مثلاً جو قطرہ موتی بننا چاہتا ہے۔ وہ سیپ میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اور پتھر سے گویا پتھر کی طرح نکلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو اشک بننا چاہتا ہے۔ پانی کی وہ بوند جو دل ہے اٹھ کر آنکھوں تک آتی ہے اس کا کیا کہنا اسے تو پلکوں کی چھاؤں اور آنکھوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ اور جس کی آنکھوں میں جگہ دی جائے وہ زیادہ قدر و قیمت ہے۔

شاعر کی خوبی اور اس کے کلام کی عمدگی کا انحصار تشبیہوں اور استعاروں کی خوبصورتیوں پر ہے۔ اگر عام اور بقول حالؔی متددا دل تشبیہیں ہی کلام میں آتی رہیں تو یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ شاعر حسن خیال، حسن نظر جدت اسلوب اور نئی فکر کے اثرات سے بالکل محروم ہے اور ایک روایتی قسم کی شاعری کرتا ہے۔ لیکن اس کے یہاں اگر نئے نئے سے استعارے اور تشبیہیں آتی رہیں اور ان سے خوبصورت Images پیدا ہوتی رہیں تو وہ شاعری کا بڑا کمال ہے۔ اسی لیے حالی نے یہ فقرے لکھ ہیں۔''وہ خود نہیں کرتے بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ حالی نے اس موقع پر ان کی بعض جدید تشبیوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ مثلاً سانس کو موج سے بوند کو سمندر سے، قطرے کو گوہر سے، بے خدمی کو دریا سے گرداب کو شعلۂ جوالہ سے تشبیہیں دی ہیں۔ لیکن جس قدر کی خیالات کی اصلاح ہوتی گئی۔ ایسی قدر تشبیوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔

غالب نے سورج کو بھی جو ستاروں میں سب سے زیادہ چمکدار اور روشن ہے اور ستاروں سے ذروں تک اس کی روشنی ہر شے کو منور کرتی ہے کیونکہ وہ ابھی اس دنیا کی مادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے اس لیے آمادۂ فنا کہا ہے۔ اور اسے 'چراغِ رہ گذر باد' سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ایسے چراغ سے جو ہوا کے راستے میں جل رہا ہے اور کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے یعنی فنا ہوسکتا ہے۔

دوسری جگہ سورج مہہ نخشب یعنی وہ طلسمی چاند جو بنایا گیا تھا۔ اور جمشید بادشاہ کے زمانے میں بنا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ رہنے والی کوئی شے تھی ہی نہیں۔ اس لیے اپنے وہمی جلووں کے ساتھ فکر اور خیال ہی کی طرح فنا بھی ہوگیا۔ اس لیے وہ چاند سورج یا دنیا کا کوئی بھی نقش آمادۂ فنا ہے۔ اور اپنے تمام حسن خوبصورتی اور کشش کے باوجود اس چراغ کی طرح ہے۔ جو ہوا کے راستے میں جل رہا ہے اور کون جانے کہ ہوا کا کوئی جھونکا اسے کب ختم کردے۔

غالب کے کلام میں عام تشبیہیں اور استعادے بہت کم ہیں۔ وہ روش عام سے ہٹ کر سوچتے سمجھتے اور کہتے

ہیں۔ اسی لیے عام روش سے واسطہ کم رکھتے ہیں۔ اور ان عام باتوں کے سہارے پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ جن کو حالی نے مبتذل کہا ہے یعنی بازاری اور گری پڑی چیزوں سے تشبیہہ مناسبت دی غالب کے اردو اور فارسی دیوان اس طرح کی نادر اور بدیع تشبیہات سے بھرے پڑے ہیں۔

مرزا کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے جس کی طرف اس مضمون میں خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ مرزا نے استعارہ، کنایہ، اور تمثیل کو بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مگر ان میں عامیانہ پن یا بازاری انداز کہیں مشکل ہی سے آیا ہے۔ وہ روش عام سے شعوری طور پر بچکر چلتے تھے اور اپنی شاعری میں اس کی پر چھائیاں بہت کم آنے دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم اس شعر سے بھی لگا سکتے ہیں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر تیرا وقت سفر یاد آیا

حالی نے اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فقرے کہے ہیں کہ دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت دل پر گذرتی ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر اس کی یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اردو شاعری میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

غالب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی ظرافت، خوش طبعی اور حسن مذاق کے تحت جو شعر کہے ان کو عامیانہ پن سے بچایا۔ اور ان میں بازاری انداز نہیں آنے دیا۔ حالی ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ مرزا کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم دیکھی گئی ہے۔ جس کو مرزا اور دوسرے ریختہ گو شعراء کے کلام میں وجہ امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ حالی نے کہا ہے کہ ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار وقع ہوا ہے کہ دی النظر میں اس کے کچھ اور معنی اور مفہوم ہوتے ہیں۔ مگر غور کرنے پر اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو ظاہر ہی معنی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اٹھا سکتے مثلاً:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب نے شاعری کو معنی آفرینی قرار دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ لفظوں میں صرف عام معنی تلاش نہیں کرتے بلکہ سطحی اور اوپری معنی سے گزر کر نئی راہیں تلاش کرتے ہیں اور اس سے اس شعر یا ان الفاظ کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اور معنی کی نئی تہیں کھلتی ہیں اور نئی سطحیں سامنے آتی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نسرین رئیس خان

مولانا محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد اردو زبان کے مشہور ادیب ،انشاپرداز ،نقاد نیز ادبی مؤرخ ہیں۔ مولانا مولوی باقر علی کے بیٹے تھے۔ مولوی محمد باقر اپنے زمانے کے معروف ادیب ،صحافت نگار اور صاحبِ علم وفن شخص تھے۔ دہلی کا پہلا اردو اخبار جس کا نام 'دہلی اردو اخبار' ہی تھا۔ مولوی باقر علی کی ادارت میں ہی نکلتا تھا۔ اور ان کی نگارشات اور تحریروں سے اس کے صفحات مزین اور قابل فخر ہوا کرتے تھے ۔مولانا محمد باقر اردو کے مشہور شاعر استاد ذوقؔ کے قریب تر دوست تھے۔ اور اسی نسبت سے مولانا محمد حسین آزاد نے ذوقؔ کی شاگردی قبول کی۔ اور آئندہ کے لیے ذوقؔ کے سب سے بڑے نقاد اور مداح بن گئے۔

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۷۷ یا ۷۸ سال کی عمر پا کر لاہور میں ۱۹۱۰ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے ۔۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران مولانا نے دہلی کو چھوڑ دیا۔ اور یہاں سے ہجرت کر کے لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے پوتے آغا محمد باقر لاہور ہی میں رہتے تھے۔ میرے استاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ان ہی کے کتب خانے اور نوادرات سے استفارہ کر کے ذوقؔ پر اپنا ڈلٹ کا مقالہ تیار کیا تھا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دوران مولانا ہجرت کے موقع پر ذوقؔ کا کلام اور اس سے متعلق نادر دستاویز اور نگارشات اپنے ساتھ لے گئے جو آغا محمد باقر کے پاس محفوظ تھے۔

دہلی سے ہجرت سے پہلے مولانا قدیم دلی کالج سے وابستہ رہے۔ یہیں پر نئے علوم وفنون سے ان کی شخصیت میں ایک نیا نکھار آیا۔ اور فکری تنوع پیدا ہوا۔ جس کے خوش آئند اور دوررس اثرات ہمیں ان کی تحریروں ،تقریروں میں دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں دربار اکبری، آب حیات، نیرنگ خیال بہت مشہور ہیں مولانا ایک

ادبی صحافت نگار بھی تھے۔ اور اس حیثیت سے بھی وہ اردو کے معروف ادیبوں صحافت نگاروں اور صاحبِ قلم انشا پردازوں میں تھے۔ اس زمانے کے معروف مصنفوں میں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، حالؔی اور شبلؔی بھی تھے۔

آزاد کی تحریر تاریخ، تہذیب ادب اور اپنے عہد کی فضا اور ماحول کے لحاظ سے ایک زندہ اور پائندہ تحریر ہوتی ہے ۔ اس میں دلی کالج میں ان کے قیام اور وہاں کے اہل علم سے تاثر کا بھی بہت بڑا حصہ ہوسکتا ہے ۔اور استاد ذوق کی اپنی شاعرانہ اور علی شخصیت کا بھی۔ 'آب حیات' مولانا کی ایک تنقیدی کتاب ہے ۔مگر وہ تنقید سے زیادہ اردو شاعری کی ادبی تاریخ ہے۔ جس میں مولانا کا اپنا اور ان کے عہد کا نکتہ نظر اور طریقِ رسائی جھلکتا ہے۔ اور اپنی ادبی، تاریخی اور تنقیدی روشوں کے اعتبار سے وہ اپنے عہد کی ایک یادگار تصنیف ہے۔ اس کی تصنیف دائرہ بندی اور موضوعات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ آب حیات تذکرہ اور تنقید کی ایک درمیانی کڑی ہے ۔اور جب وقت بدلتا ہے۔ تو اس طرح کی کوشش ادبی، تہذیبی، اور تاریخی پہلو داریوں کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کا ادب جو ایک رخ بدلتا اور نئی منزلوں کی طرف آگے بڑھتا نظر آتا ہے ۔ہماری تنقید کو بھی ایک نیا رخ عطا کرتا ہے ۔جیسے ہم مولانا کی تحریروں میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

دربار اکبری مولانا محمد حسین آزاد کی ایک تاریخی تصنیف ہے۔ اس میں اکبر اعظم کے زمانے کی ایک متحرک تصویر اپنی بہت سے پہلوداریوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے ۔اس کتاب میں مولانا نے انشا پردازی کے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں۔ اگرچہ ان کا تاریخ سے وفاداری کا رشتہ جگہ جگہ کمزور پڑتا نظر آتا ہے ۔اور اس کی وجہ مولانا کا خوبصورت انداز بیان ہے ۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مولانا نے اپنے قلم کی سحر بیانی سے ایک ایسی فضا تخلیق کی جس کی وجہ سے ہم اس دور اور اس ماحول کو زندہ و متحرک اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ مولانا نے اپنی انشا پردازی سے تاریخ جیسے موضوع کو بھی دلچسپ اور رنگین بنا دیا ہے ۔جسے پڑھ کر انسان بور نہیں ہوتا۔ دربار اکبری ایک مختصر تاریخ ہے ۔جس کا بیان یہ کہئے کہ ایک ادب نامے کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔

'نیرنگ خیال' مولانا کی سب سے دلچسپ اور اہم کتاب ہے ۔اس کتاب کا اندازِ بیان شروع سے آخیر تک تمثیلی ہے ۔ اس کتاب میں جو قصے کہانیاں اور لطائف آتے ہیں۔ ان کی ایک نمایاں تمثیلی حیثیت ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں ایک ڈرامائی انداز بیان پیدا ہوگیا ہے ۔اس کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی طرز ان کے بیان کی جان ہے ۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مولانا اپنے اس طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی اس سلسلے میں یہ بیان بھی سامنے آتا ہے ۔کہ سرسید کے مقلد حالؔی تھے۔ سید سلیمان ندوی نے شبلؔی کی بڑی خوبی سے نقل کی اور نذیر احمد کے رنگ میں میاں افتخار عالم نے اپنے جوہر دکھائے۔ حالؔی کا چربہ عبدالحق نے اتارا ہے ۔لیکن آزاد کی تصویر اتارنی تو کیا کسی نے خاکہ بھی نہ اتارا۔ مولانا

پر انگریزی ادب کا بہت گہرا اثر ہے۔ جو ان کی تحریروں میں فقروں جملوں کی تراش خراش میں مفہوم کی معنوی وسعت ،اور نکتہ نظر کی جدت و ندرت میں موقع بہ موقع ابھرتا ہے اور سامنے آتا ہے۔

اردو میں انگریزی جیسی نئی زبان اور اس کے انداز بیان کو سمو لینا ایک بڑی بات تھی۔ اور مولانا محمد حسین آزاد جیسا کوئی ادیب اپنی ایجادو افتراع کی قوت سے کام لے کر اس طرح کا کوئی کام اور کارنامہ بھی انجام دے سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ہم اس Comantmant سے بھی گزرتے ہیں کہ ان کے اندازِ بیان میں جہاں حالؔی کی سادگی ،اور نذیر احمد کے علم کی گہرائی مفقود ہے۔ وہاں ان کے یہاں نہ تو حالؔی کی خشکی ہے اور نہ نذیر احمد کے پندو نصیحت کے دفتر۔ آزاد کی نثر پڑھنے کے بعد آدمی ان کے الفاظ کی رنگینی میں کھو جاتا ہے۔

اردو شاعری کا بیشتر حصہ غزلیہ شاعری قصائد و مثنویات پر مشتمل تھا۔ لیکن نئے دور میں غزل اور قصائد کے دفتر عام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے تھے۔ نئے زمانے کی نئی فضا میں جو افکار رونما ہورہے تھے۔ اس میں نئی نظم کے فارم کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اور اس سلسلے میں شاعری کو نئے انداز میں پیش کرنے کی اولیت کا فخر آزاد اور ان کے معاصرین کو حاصل ہوا۔ اس میں انجمن پنجاب کے نام سے ایک ادبی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں نئی بات یہ تھی کہ مصرعہ طرح دینے کے بجائے کوئی موضوع نظم لکھنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنی نظم نگاری کے لیے جن موضوعات کو اپنایا ، ان کا تعلق سماج اور روز مرہ کی زندگی سے اس کے معاملات اور معمولات کے ساتھ ہے۔ یہ گویا فکر فرمائی اور شعر شعور کے دائرے میں ایک نئی نتیجہ خیز اور دور بین تبدیلی تھی۔ جس نے اردو شاعری کے ماحول اور فکری منظر نامے کو بہت کچھ بدل دیا۔ جدید اردو شاعری کا آغاز و ارتقا اسی فکری اور نظریاتی انقلاب کا مرہونِ منت ہے۔

اس دور کو نئی شاعری اور خاص طور پر اردو نظم سے وابستہ کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد کا وہ فکری خاکہ جو اردو نظم کے پانچ دور میں سامنے آتا ہے ۔اس کی روشنی میں ہم اردو شاعری اور سماجی شعور کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور مختلف ادوار کی روشنی میں اس کی پیش رفت کو مختلف ادوار کی نسبت اور واسطے کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصرعہ طرح پر غزلیں کہنے کے بجائے شاعر ایک موضوع مسلسل پر مربوط نظم لکھتے تھے۔ اور پوری نظم ایک ہی خیال کے تحت لکھی جاتی تھی۔ اس مشاعرے سے اردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا چلن عام ہوا۔

لاہور کا قیام مولانا کی زندگی اور ادبی کاوشوں میں نئے نشان منزل کی حقیقت رکھتا ہے۔ اسے ہم ایک بڑے ادبی موڑ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کی فرمائش پر آزاد نے اردو فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں

لکھیں۔ جن کی اہمیت کا آج بھی ہم محض بچوں کی کتابیں قرار دے کر کم نہیں کر سکتے۔ یہ کتابیں آج بھی اپنی ایک اہمیت رکھتی ہیں۔ اور اردو میں اس نوعیت کی کتابوں کے پہلے نمونے ہیں۔ یہاں سے گویا قدیم انداز تحریر کو بدل کر نئے انداز فکر کی طرف ہجرت کی جاری ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کو تاریخ سے بطور خاص دلچسپی تھی۔ وہ تاریخ کے اہم اور دلچسپ واقعات میں بھی ادبی لطافت اور کشش محسوس کرتے تھے۔ اور اس کو اس طرح بیان کرتے تھے۔ کہ جیسے کوئی دلچسپ کہانی اور پر لطف قصہ بیان کر رہے ہوں۔ اس طرح آزاد کو پڑھنے والے انہیں بیک وقت ایک ادیب ،ایک تاریخ داں ،ایک نکتہ نظر والے انسان کی طرح پڑھتے ہیں۔

مولانا کی ادبی صلاحیت او ران کے دائرۂ معلومات کی رنگا رنگی او روسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا گیا ے کہ ان کی معلومات کی وسعت اور گہرائی کا انداز ہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا قلم تذکرہ ،تبصرہ ،تنقید ،تاریخ ،لسانیات، تمثیل اور شاعری کے میدان میں یکساں اپنا کمال دیکھاتا ہے۔

مولانا کو سیر وسیاحت کا بھی بے حد شوق تھا۔ اور انہیں اپنا شوق پورا کرنے کے کئی مواقع بھی میسر آئے۔ جس کے تحت وہ ایران وتوران افغانستان کے علاوہ دیگر ممالک بھی گئے۔ اپنے سفر کی جو رودادیں انہوں نے پیش کی ہیں۔ وہ ان کے ذوق سیاحت کاایک خوبصورت مرقع ہیں۔ مولانا کس طرح کی باتیں کرتے ہوں گے اس پر تو بہت کم لکھا گیا ہے۔ یا یہ کہئے کہ توجہ ہی نہیں دی گئی۔ لیکن بزبان قلم ان کے باتیں کرنے کا ڈھنگ اور رنگا رنگ کیفیت بہت دلچسپ اور پرکشش ہے۔ مہدی افادی نے ایک موقع پر لکھاہے کہ' آزاد اردو معلّٰی کا ہیرو ہے' وہ اپنے قلم سے اگر ادھر ادھر کی بھی باتیں لکھ جاتا ہے۔ تو وحی الٰہی معلوم ہوتی ہے ،اس کے باوجود کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز اور قلم کار ہیں۔ ان کی باتوں میں وزن و وقار ہے۔ وہ ان کے گہرے مطالعہ پر روشنی ڈالتی ہے ۔مطالعے کی وسعت نکتہ نظر کی طرفگی اور الفاظ کی رنگا رنگی ایسی خوبی ہے جو ان کی ہرتحریر کو روشنی اور رعنائی سے آراستہ کرتی ہے۔ کوئی بھی تحریر اٹھا لیجئے اس میں ان کی معلومات کی جھلکیاں اور بیشتر وسعتیں ملتی ہی ہیں۔ بڑی بات ان کے نکتہ نظر کی خوبی اور طرز ادا کی خوبصورتی ہوتی ہے ۔جن سے ان کا ایک پڑھنے اور مطالعہ کرنے والا آدمی متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

آبِ حیات میں ادب ،زبان ،بیان، انداز نظر، اور طریق فکر نیز طرز ادا کے جو کرشمے آزاد کی زبان اور زبان قلم میں ملتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر پڑھنے یا مطالعہ کرنے والے کے ذہن پر اپنا تاثر قائم کرتے ہیں۔اور یہ تاثر اکثر ایک دور پر محیط ہوجاتا ہے۔ اور جب ہم اس موضوع کو پڑھتے ہیں اور ان مضامین وخیالات پر سوچتے ہیں ۔تو مولانا کی اپنی تحریر نظر کے سامنے آجاتی ہے ۔اس معنی میں مولانا اردو کے ایک ناقابل فراموش قلم کار اور مصنف ہیں۔ کہ جن کی راہ صدیاں تکتی

رہیں گی۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ شعر پیش کر دینا میرے ذہن کے لیے ایک تقاضا بن گیا ہے ۔

راہ تکا کرے گا صدیوں تک
جب ہم چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

☆☆☆

ڈاکٹر نسرین رئیس خان

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

نیرنگ خیال محمد حسین آزاد کی اہم ادبی تصانیف میں ہے۔جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔یعنی خیالات کی رنگارنگی اور پھر رنگوں میں تبدیلیاں جو پورے منظر نامے کو ایک تماشہ اور عجیب وغریب کھیل بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔نیرنگ خیال میں شامل یہ مضمون سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ سچ اپنی جگہ سچ ہے۔جھوٹ میں جو دلکشی اور رنگارنگی ہے۔وہ سچ کی سادگی میں نہیں ملتی۔سادہ بیان میں کوئی پیچ داری حسن اور رنگینی نہیں ہوتی۔جبکہ بیان کو دلکش اور رنگین بنانے کے لئے اس میں طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کی جاتی ہیں۔اور اسی وجہ سے سادہ سچ کے مقابلے میں رنگارنگ جھوٹ یا دروغ زیادہ پرفریب اور دیدہ زیب نظر آتا ہے۔بہر حال جھوٹ اور سچ میں کشمکش اور نزاع کا جو رشتہ ہے وہ ان کو ذہن کے لئے زیادہ پر پیچ اور حسن وکشش کا باعث بنائے رکھتا ہے۔

کیونکہ یہ ایک انشائیہ بھی ہے۔اس لئے اس کے بیان کو انشایا شعری عبارت آرائیوں سے سجایا گیا ہے۔زبان تھوڑی مشکل ہوگئی ہے۔مگر اس کی وجہ اس کا ادبی اور شعری رنگ ہے۔اس زمانے میں زبان کو اور خاص طور پر ادبی زبان کو دلکش بنانے کا شوق اور اس میں رنگینیاں پیدا کرنے کا ذوق اہل زبان اور ارباب قلم کو زیادہ ہوتا تھا۔اس کا اندازہ ہم فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور اس کے تقریبا نصف صدی بعد تک کے دورے نگارش میں دیکھ سکتے ہیں ہماری زبان کے ادبی صفحات کو ہم ایسی زبان سے بھی آراستہ پیراستہ دیکھتے ہیں۔جیسے مسجع اور مرصع زبان کہا جاتا ہے۔زبان میں سادگی سلاست،حسن اور دل آویزی اس زمانے کے ادیبوں کا خصوصی رجحان نہیں تھا۔عام گفتگو میں بھی وہ لوگ زبان سازی اور فقرے بازی مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔اور اپنی تحریر کو خاص طور سے ایک ادب نامہ بنانے کے لیے حسین فقروں اور گوناگوں رعنائیوں اور رنگینیوں سے آراستہ کرنے میں ان کا ذہن زبان اور زبان قلم خصوصی انداز نگارش اور اسلوب تحریر سے آراستہ پیراستہ ہوتا تھا۔اس کی جھلکیاں اس مضمون میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

".....وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر
ششہ جادو مارتا تھا۔تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے"

یہ عبارت اپنے مختلف اجزا کے اعتبار سے داستانوں کی طرح دل کش فقروں اور حسین جملوں سے سجائی گئی ہے۔جو آج کے دور میں اپنے زمانے کے طرز سخن اور حسن بیان نیز لطف زبان کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہے۔اور آج یہ انداز تحریر دیکھنے اور سننے میں نہیں آتی

۔یہ صرف کتابوں میں ہی ملتی ہے۔اس کا نتیجہ اس جملے میں پیش کیا گیا ہے۔غرض کہ بہت کم انسان ہونگے جن میں یہ حوصلہ واستقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم رہیں۔''

یہ مضمون محاوراتی زبان سے متاثر ہے۔اور انشا پردازانہ طرز ادا اور اسلوب نگارش کے نمونے مختلف لفظیات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔جیسے مشت خاک، دیو آتش زاد، مکروہ دغا کی چاٹ یہ تو لفظیات ہیں۔پورے کے پورے جملے بلکہ فقرات کا مجموعہ قدیمانہ انداز نگارش کو پیش کرتا ہے۔جیسے جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہے، اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے۔غرض کہ بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ اور استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم رہیں۔ان جملوں سے قدیمانہ انداز فکر اور کلاسیکی طرز و روش پر ایک عکس ریز روشنی پڑتی ہے۔اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مصنف کے ان فقروں کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔''

> اسی طرح جب جلسوں میں نمود یئے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید کچھ ڈر کچھ مروت سے، غرض چارنا چار کبھی ان کے ساتھ ساتھ کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔.....سچ کا عجیب حال ہے۔کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے بر خلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا معلوم نہیں ہوتا۔

اس مضمون میں آگے چل کر ہم ایک ایسے پیراگراف سے گزرتے ہیں جس کی عبارت بہت حد تک پر تکلف ہے۔اور آرائش و زیبائش کے نئے آرائشی فقرات سے زینت بخشی گئی ہے۔

> ''واضع ہو کہ ملکہ صداقت زمانی، سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔جبکہ ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا، تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی، عزت دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا''

یہ تخیلی اور تمثیلی بات ہے۔اور ایک خیالی کردار ہے۔جو سچ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔اس میں اس زمانے کے کچھ ادب و آداب اور معاشرتی رویے سامنے آتے ہیں۔مثلاً جب شہزادی پڑھ لکھ گئی۔اور اس کو ادب و آداب آ گئے۔تو دربار میں حاضری کی اجازت

ملی اور بارگاہ سلطانی میں وہ سلام پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ اور شاہی نوازش کے طور پر اس کے سر پر تاج مرصع رکھا گیا۔ دربار میں بھانڈوں کی آمد کا بھی ذکر آیا ہے۔ جو تفریحی اور ہنسی مذاق کے مناظر پیش کرنے کے لئے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔

اب سے کچھ زمانے پہلے تک تفریحی کی محفلوں میں نقال اور بھانڈ بھی بلائے جاتے تھے۔ جن تھیٹروں میں قصہ کہانیاں بطور نمائش پیش کئے جاتے تھے۔ ان میں بھی بھانڈوں کو دعوت دی جاتی تھی۔ باقاعدہ ان کی فیس ادا کر کے انھیں محفلوں کی زینت بنایا جاتا تھا۔ اور وہ دوسروں کو ہنسنے ہنسانے کے مواقع پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں اس طرح خیالی قصے کہانیاں اور منظر نامے تفریحی پروگراموں میں تفریحی کے ساتھ ساتھ نصحت کرنا بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس غرض سے ہمشیہ دو متضاد کردار پیش کئے جاتے تھے۔ اچھا اور برا۔ اس لئے کہ شیطان اور رحمان زندگی کے دو اہم پہلو ہیں۔ اور ان ہی کو پیش کرنا مقصد بھی ہوتا تھا۔ اس مضمون میں بھی اچھائی اور برائی دونوں ہی شامل ہیں۔ مگر فتح سچ یا سچائی کی ہی ہوتی ہے۔ اور یہ گویا زندگی کا اصل انجام ہے۔ کہ بلآ خیر سچ کامیاب اور جھوٹ ناکام ہوا۔ جو اخلاقی تربیت کی غرض سے قصوں کہانیوں میں شامل کیا جاتا تھا۔

اس مضمون کے اس حصے میں سچ اور جھوٹ دونوں ہی کے کرداروں کو سامنے لا گیا ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے۔ کہ سچ میں کتنی طاقت ہے۔ اور جھوٹ کتنا ہی خوبصورت اور پر کشش ہو اس میں پائیداری نہیں ہوتی اور وہ مستقل خرابی سے محروم ہوتا ہے۔ سچ کے آگے دنیا سر جھکا دیتی ہے۔ اور جھوٹ آخر کار ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جھوٹ کے پاوں نہیں ہوتے وہ چل نہیں سکتا۔ اچھائی برائی سچ اور جھوٹ غلط اور صحیح میں برابر مقابلہ تناتنی اور لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے اس کی طرف مضمون میں بھی اشارے موجود ہیں۔ اور نتیجہ بھی یہاں وہاں سامنے آتا رہتا ہے۔ فتح آخیر کار سچ ہی کی ہے۔ مگر جھوٹ اپنے فریبوں اور دغا بازیوں سے بھول بھلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کشمکش اور تضاد کو یہاں قصے کے اتار چڑھاو میں شامل کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ اس طرح کی باتیں زندگی کے معاملات اور باہمی الجھاو میں برابر سامنے آتی رہتی ہے۔

مولانا آزاد نے اس مضمون میں خاص طور پر دو کرداروں کو اپنا موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ایک سچ اور دوسرا جھوٹ۔ اور ان دونوں کی باہمی رنجشیں لڑائی اور کشمکش سے جو سبق ہمیں ملتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ سچ کو ہی اپنانا چاہیے۔ اور اس راستے میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔ کہ یہی آگے چل کر ایک تابناک مستقبل کے روشن نشانات بنیں گے۔ لیکن جھوٹ وہ وادی ہے۔ جس میں قدم رکھ کر انسان خود زندگی کی بھول بھلیوں اور پر چھائیوں میں کھو جاتا ہے۔ اور ذلت اور رسوائی کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اس دنیائے فانی کا کیا کیا جائے۔ کہ وہ سچائی کے راستے کو کٹھن دیکھ کر جلدی ہی پیترہ بدلتی ہے۔ اور بات کو ادھر سے ادھر لے آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملکہ صداقت اس فطرت سے سخت مایوس ہے۔ اور اس کی مایوسی اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے آسمانی باپ سے التجا کر بیٹھتی ہے۔ کہ مجھے سخت جدوجہد کے بعد کوئی کامیابی نہیں ملی اس لئے میں چاہتی ہوں کہ مجھے واپس بلا لیا جائے۔

یہ بات آسمانی باپ کو پسند نہیں آتی اور فوراً ہی ایک مٹنگ طلب کی کہ آخر کیا وجوہات ہیں۔ جس سے ملکہ صداقت کو کامیابی نہیں ملی اور وہ دل برداشتہ ہو کر واپس آنا چاہتی ہے۔ اس امر پر غور کیا گیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور اب آگے کیا کاروائی کی جائے تو اس مٹنگ میں یہ

طے پایا کہ ملکہ صداقت کو ایسا لباس پہنایا جائے جو جھوٹ یعنی دروغ دیوزاد جیسا ہو۔ اور اس لباس کا نام مصلحت زمانہ رکھا گیا۔ کہ ملکہ صداقت پیراہن مصلحت زمانہ زیب تن کر کے جھوٹ اور فریب کو اپنے حق میں استعمال کر کے مناسب وقت پر جھوٹ کی قلعی کھول دے۔

مولانا نے دراصل اپنے زمانے کے خیالات اور سوالات کے مابین کشمکش کو پیش کیا ہے۔ لوگ کہتے کچھ ہیں۔ کرتے کچھ ہیں۔ مولانا جو کہتے ہیں۔ وہ ان کا عمل بھی ہے۔ اس طرح ان کے زمانے کے لوگ اور وہ اپنے کردار میں مختلف ہو گئے ہیں۔ اور ان میں ایک ٹکراو تضاد اور تصادم کا سا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں مصلحت وقت یہ ہے۔ کہ زندگی میں تھوڑی تبدیلی لائی جائے۔ لوگوں سے دور نہ رہ کر ان سے قریب ہوا جائے۔ اور ان کا دوست بن کر ان کے رویے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے۔

مولانا کی جتنی بھی تحریریں ہیں۔ وہ اس وقت کے ماحول اور ذہنی ٹکراؤ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس زمانے میں ایک مولانا ہی کیا ہمارے بہت سے اہل دانش ہیں اور جو قوم کی اصلاح چاہتے ہیں۔ ان کی مشکل یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی ہوں، شبلی ہوں، یا مولانا محمد حسین آزاد سب ہی کی تحریروں میں ہمیں یہی اسلوب تحریر اور طریق رسائی نظر آتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

مختصر افسانہ

یوں تو انسان بذات خود ایک کہانی سے زندگی کا بیتا ہوا ہر لمحہ دل پر گذرا ہوا ہر سانحہ کائنات کی آغوش میں پایا ہوا ہر واقعہ وقت کے ساتھ کہانی کا روپ اختیار کر لیتا ہے، انسان تخیل کے پرواز کو جب اس تک پہونچاتا ہے تو لطف محسوس کرتا ہے زندگی کتنی ہی کیوں نہ بدل جائے انسان کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے تہذیب وتمدن کیوں نہ آگے بڑھ جائیں۔ انسان کا یہ احساس زائل نہیں ہوسکتا جذبات نہ ہوتو زندگی کی محفل ہوتی ہے رنگ و بو اور جامد ہوکر رہ جائے یہ جذبات ہی ہیں جنہوں نے کہانی کو پیدا کیا افسانہ بھی اسی کہانی کی ایک زندہ حقیقت ہے۔

اردو میں افسانہ مغربی ادب سے آیا۔ ۱۹ ویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور نئے حالات کی وجہ سے یہ صنف وجود میں آیا۔

ایک زمانہ تھا جب بہت لوگوں کے پاس بہت وقت تھا۔ داستان یا لمبے چوڑے قصے کہانیاں لوگ سنتے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرا انسانی دماغ نے ترقی کی سائنس نے ترقی کی لوگوں نے محسوس کیا کہ کم وقت میں اپنی ادبی تشنگی کو ختم کیا جائے۔ تھوڑے سے وقت میں اچھا اور دلچسپ موضوع ہاتھ لگے شاید اسی وجہ سے افسانے وجود میں آئے۔ ایک ایسا نثری قصہ جو کم سے کم وقت میں پڑھا جاسکے۔ اختصار ضروری تھا۔

مختصر افسانے کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

> ''مختصر افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف اور امتیازی صنف ہے جو اتفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی کی ایک واضح فنی صورت ہے اور ایجاز و اختصار جہت، فنی، حسن اور تخیل، کی چاشنی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں''۔

> ''مختصر افسانہ ایک مختصر تخیلی تعلیق ہے جس سے کسی ایک واقع ایک مخصوص کردار کا نقش پلاٹ کے ذریعہ اس طرح سے ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں ایک مخصوص تاثر پیدا ہوسکے''۔

مختصر افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ مختصر افسانے کی نثر ایک مختصر بیانیہ تحریر ہے (تخلیق ہے جو ایک واحد ڈرامائی واقعے کو ابھارتی ہے۔

بیسوی صدی کے ابتدائی دہائی یا پہلی دہائی کی اس اعتبار سے اہم ہے کہ ہندوستانی زبانوں کا تعلق مغربی ادب سے براہ راست پیدا ہوتے ہیں۔ اور مختلف ادبی اصناف کے نمونوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں مختصر افسانے سے ملتی جلتی نثر کی ایک خاص صنف جسے انشائیہ کہتے ہیں ہمارے سامنے آتی ہے ان انشائیوں میں اسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں زندگی کے مسائل پر فلسفیانہ انداز سے گفتگو کی ہے ان مضامین میں طنز کا استعمال عام ہے۔

محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال میں تمثیلی رنگ کے افسانے بھی لکھے تھے۔ سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر ہلدرم نے بھی افسانے لکھے۔ مگر انکی تحریروں کو افسانے کا نام نہیں دے سکتے مجموعی طور پر مختصر طور پر افسانے کے جوفنی لوازم ہوتے ہیں ان میں نظر نہیں آتے۔ ابتدائی انشائیے نما افسانوں میں رومانیت جوش شدت اور پر تصنع اسلوب سجاوٹ آرائش کا زیادہ عکس ملتا ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کی بنیاد پر پریم چند نے ڈالی۔ اس سے قبل اردو میں مختصر کہانیوں کے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ پریم چند صحیح معنوں میں اردو کے ابتدائی افسانہ نگار ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں انگار افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن لکھا۔ انمول رتن انہوں نے اس قطرے کو کہا جو وطن کی راہ میں بہایا جائے۔ پریم چند کے ابتدائی افسانے جذباتی نوعیت رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب پر تصنع ان کے کردار شاعرانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں ان کے افسانے حق پر تصنع ان کے کردار شاعرانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں ان کے افسانے حق پر ختم ہوتے ہیں یہ سب چیزیں بڑی حد تک داستان کے اثرات کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔ پریم چند بنگالی افسانوں سے متاثر ہوکر مختصر افسانے کی طرف رجوع ہوئے۔

بیسوئیں صدی کے دوسرے اور تیسرے دور میں نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری بھی افسانہ کی طرف مائل ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو میں روسی، فرانسیسی اور انگریزی کے معیاری افسانوں کے ترجمے ہوئے۔ منصور احمد، خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی اور دوسرے ادیبوں نے ترجمے کا کام بخوبی کی۔ اس دور کے اردو افسانوں میں تین طرح کے رجحانات پائے جاتے ہیں پہلا جو پریم چند کے ماننے والوں کا ہے۔

سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور اپندر ناتھ اشک کا تھا ان لوگوں نے حالات کے مدنظر اس وقت کے مسائل کو اپنی تخلیق میں جگہ دی۔ عام انسانوں کی محرومیوں اور تکلیفوں پر نظر رکھا۔ اور اتنے موثر انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا کہ ہمارے دلوں میں بھی ان کے لئے تڑپ پیدا ہوگئی۔

دوسرا وہ گروپ جس کا رجحان رومانی اور جذباتی تھا۔ سجاد حیدر بلدرم، نیاز فتح پوری، اور مجنوں گورکھپوری کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے بدلتے ہوئے زندگی اور زمانے کے لئے تقاضوں کا احساس ہے۔ انہوں نے انسانی جذبات کے لئے کسی بندش کو برداشت نہیں کیا۔ یہ افسانوی دنیا کے لئے نیا انداز تھا۔ تیسرا طبقہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کی گھریلوں زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کرنے میں لگا تھا۔ اصلاح کا بھی متمنی تھا۔ اس سلسلہ کے اہم کردار ہیں نذیر احمد، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، فضل الحق

قریشی، اور عظیم بیگ ۔ چغتائی کا نام لیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے ان لوگوں نے افسانے کے معیار کو بلند کیا۔

۱۹۳۴ء کے بعد ادیبوں کا ایک نیا طبقہ ابھر کر سامنے آیا ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانوں میں نئے انداز پیدا ہوئے ۔ حقیقت نگاری کا تصور عام ہوا۔ تخیل اور تصور کی دنیا سے باہر نکلے۔ سماج کی بے لاگ تصویر پیش کی۔ پریم چند نے اس روایت میں اہم رول ادا کیا۔ کرشن چندر، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، کے یہاں رومانی تصور تھا۔ بعد میں ان کے افسانوں نے بھی سماجی موضوعات کو شامل کیا۔ جس سے افسانوں کی دلکشی دوبالا ہوگئی۔ اس دور میں پروفیسر مجیب، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری، اور دوسرے ادیبوں نے بھی افسانے لکھے۔ کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

کرشن چند کا انداز شاعرانہ تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے سماجی ناانصافیوں کے لئے آواز اٹھائی۔ منٹو کے افسانوں میں جنسی اور نفسیاتی انداز میں ڈوبے تھے۔ عصمت نے مسلمانوں کی گھریلو زندگی کے مسائل اور الجھنوں کو پیش کیا ہے۔ بیدی اور ندیم نے پنجاب کے گاؤں کی سچی اور سیدھی سادی زندگی کو موضوع بنایا آزادی کے بعد بھی ادیبوں کا یہ قافلہ رواں دواں رہا۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کے لوگوں نے جن پریشانیوں کا سامنا کیا اسے ادیب کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے ان حالات کو موضوع بنایا۔ شروع میں کثرت سے کہانیاں لکھی گئیں۔ گاندھی جی کا قتل ہندوستانی تاریخ میں ایک بڑا اہم سانحہ اور واقعہ تھا۔ نتیجہ میں جو ہندوستان میں جو حالات پیدا ہوئے ادیبوں کا قلم کیسے چپ رہتا۔ حالات کا عکس افسانوں میں موجود ہے۔ منٹو، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی نے اس موضوع پر بہت اچھے موثر افسانے لکھے۔ مثلاً موذیل، لاجونتی اور ہم وحشی ہیں۔

آزادی کے بعد قرۃ العین حیدر، غلام عباس، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، اور انتظار حسین نے بہت کچھ لکھا۔ جس کے زیر اثر افسانوں میں نئے نئے موضوع شامل ہوئے۔ مزید ترقی ہوئی اور اس دور کے افسانوں میں انسان کو فرد کی اہمیت کا نمایاں کیا گیا کردار نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔

نئے افسانہ نگاروں میں انور عظیم، بلونت سنگھ۔ اقبال متین، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار کے نام قابل ذکر ہیں ان لوگوں نے اچھے اور کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی او رمعاشی عوامل کارفرما ہیں۔ انسان دوستی اور فن کا گہرا شعور ملتا ہے۔ اس موجودہ دور میں بھی افسانے لکھے جارہے ہیں۔ جس سے یہ صنف ترقی کی راہوں پر گامزن ہے افسانہ کا شمار دنیائے بہترین فن پاروں میں ہوتا ہے شاید اسی لئے یہ نثر کی سب سے مقبول صنف ہے۔

☆☆☆

پریم چند
۱۸۸۰ء—۱۹۳۶ء

اردو نثر کی تاریخ میں پریم چند کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کا مستحق ہے۔ ایک طرف انہوں نے ادبی دنیا میں سنجیدہ ناول اور افسانے کی ایک کثیر تعداد چھوڑی تو دوسری طرف نثر کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے۔ پریم چند کی زبان بڑی سادہ رواں سلیس ہوتی ہے۔ ہندی الفاظ کا خوبصورت استعمال کر کے گنگا جمنی روایت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ پریم چند کے ناول اور افسانوں میں ہندوستان کی دیہی زندگی کا دل دھڑکتا ہے۔ سماج کو بہت ڈوب کر دیکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ گہرا تھا۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے دیہی زندگی کے کامیاب مرقع پیش کئے ہیں۔ دیہات کے لوگوں کی سچائی ایمانداری کو انہوں نے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے کردار سچ بولتے ہیں۔ ایک طرف گاؤں کا ایک ایسا کردار ابھرتا ہے۔ جو اپنی تمام تر مفلسی جاہلیت کے باوجود زندگی کے اقدار کا امین ہے تو دوسری طرف شہروں کی چکاچوند ہیں زندگی میں اور اپنے کو ترقی یافتہ کہلانے کی دوڑ میں اپنا سب سے قیمتی سرمایہ بھول چکے ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے وہ کنگال ہیں صبر اور شکر سے کوسوں دور۔ پریم چند نے زندگی کی زبوں حالی اور اس کی بے بسی پر آنسو نہیں بہایا بلکہ غور و فکر کے تمام امکانات روشن رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں زندگی کو حرارت بخشتی ہیں ایسے دور میں جب ہندوستان غلام تھا۔ جمود نے ہر سو اپنے پاؤں کو پھیلا رکھا تھا۔ علم سے اکثر لوگ بے بہرہ تھے اور جو تھوڑے سے لوگ علم کی روشنی سے مستفید سو رہے تھے ان کی احساس برتری نے ان سے زندگی کے خوبصورت اور لازوال احساس کو چھین لیا تھا۔ چھوٹے لوگوں کو کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔ دیہات میں پروہت مہاجن، زمیندار جس طرح کسانوں کے خون چوس رہے تھے اس کا پورا نقشہ پریم چند نے پیش کیا ہے۔

پریم چند نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک ٹیچر کی حیثیت سے شروع کیا بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہو گئے تھے ۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو پریم چند نے بھی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد وہ پوری طرح لکھنے کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں افسانہ لکھ کر اپنی حقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ پریم چند شروع میں بنگالی افسانوں سے متاثر ہوئے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز و وطن'' ۱۹۰۸ میں شائع ہوا۔ ابتدائی افسانوں میں قدیم داستانوں کا رنگ دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن بعد میں پریم چند نے بڑے گھر کی بیٹی، مامتا، اور کرشمہ، انتقام، جیسے

افسانے لکھ کو ۱۹۱۲ء اردو میں افسانہ نگاری کے فن کو نئی منزل نئی جہت عطا کردی، ان کے افسانوی مجموعے پریم پچیسی، پریم بتیسی، واردات، زادِ راہ وغیرہ میں ان کے دیگر افسانوں میں قاتل کی ماں۔ زیور کا ڈبہ، گلی ڈنڈا، عید گاہ، نمک کا داروغہ، کفن، روشنی وغیرہ قابل ذکر ہیں ان کے افسانوں میں طنز وظرافت کے پہلو بھی صاف نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت کے اس قومی مسائل بے حد پیچیدہ تھے ایک طرف عوام کے اقتصادی اور طبقاتی مسائل تھے تو دوسری قومی آزادی کا سوال تھا۔ پریم چند نے تمام پیچیدہ مسائل پر غور فکر کیا اور اپنی تحریروں میں اس عہد کے عام انسانوں کی تصویر ان کی تمام سیاسی اور تہذیبی رابطوں کے ساتھ پس منظر میں ابھارا۔

پریم چند نے اپنے عہد کی زندگی اور اس کے مسئلوں کو ایک انسان دوست ادیب کے نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔ جس طبقے کے افراد کو انہوں نے زیادہ مظلومی اور پریشانی کی حالت میں پایا۔ اتنی ہی زیادہ ہمدردی اور دلچسپی سے انہوں نے اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ان کا حساس دل اور فنکارانہ ذہن مذہب وملت ذات و پات اور رنگ ونسل کی قید سے آزاد تھا۔ وہ گاؤں کے نچلے متوسط طبقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اور بچپن کا بڑا حصہ گاؤں میں گزرا۔ اس لیے انہیں دیہی زندگی سے ایک خاص جذباتی تعلق رہا۔ اسی طرح نچلے متوسط طبقے کی زندگی سے ان کی واقفیت گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زیادہ صفائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ احتشام حسین نے لکھا ہے۔

> ''یہ پریم چند کا ہی کام تھا کہ انہوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوی ادب کا ہیرو بنایا اور اس دنیا ی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جاندار اور حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی مظہر تھی۔ پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعور طور پر ادب کے ذریعہ عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔ یہ انسان دوستی پریم چند کے فن کا سب سے مقدس ورثہ ہے جس نے ان کے معاصرین اور اس کے بعد آنے والے ادیبوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔''

پریم چند کا نظریہ حیات ان کی افسانوی ادب میں نمایاں سے ان کے ابتدائی دور کی تخلیقات میں زندگی کی ناپائداری کا احساس ملتا ہے زندگی فانی ہونے کے ساتھ ساتھ نازک بھی ہے۔ اس نزاکت میں ایسی طاقت ہے جو اسے فروغ دیتی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کا ایک دلکش پہلو ان کی زبان اور انداز بیان ہے جو ان کی شخصیت کی نمائندہ ہے۔ ان کی ابتدائی دور کی تخلیقات میں چونکہ ان کے تجربات محدود تھے۔ اس لیے ان کا طرز تحریر رومانی ہے۔

دوسری منزل وہ ہے جب پریم چند جذبات کے دھندلکوں سے گذر کر زندگی کی حقیقتوں کو بے حجاب دیکھتے ہیں اس دور کے ناولوں میں گوشہ عافیت، نرملا، چوگان ہستی، اور 'پردہ مجاز' میں اس عہد کی زندگی اپنی تمام پیچیدگی اور وسعت کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ یہ تخلیقی جنگ عظیم کے بعد کی ہیں۔ اس وقت طبقاتی کشمکش نے ہندوستان میں ایک واضح اور شعوری حیثیت اختیار کرلی تھی۔ روس میں اکتوبر انقلاب کی کامیابی سے دنیا کے ایک بڑے ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ جس نے ہندوستان

اور دوسرے مشرقی ممالک کی عوامی تحریکوں کو ایک نیا جوش اور ولولہ دیا۔ پریم چند کی انسان دوستی اس زندگی کے مظاہرے میں حسن اور حقیقت کی جستجو کرتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے بے پناہ حوصلوں اور بیکراں قوت کے باوجود تلخیوں اور محرومیوں کا شکار ہے۔ غلامی اور مفلسی کی اذیتوں سے کراہ کراہ رہا ہے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند فنکار کی طرح اس زندگی کی بے لاگ عکاسی کرتے ہیں۔

حقیقت کی تلاش میں انہیں انسان کی بدحالہ اور تلخ کامی کے اسباب کی طرف متوجہ کرتی ہے جن کی تلاش میں ان کی نظر زندگی کے خارجی اور ظاہری پہلوؤں سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچتی ہے۔ اس طرح وہ حسن کو خیر کی صورت میں یا انسان کی نیکیوں اور ان اخلاقی قدروں کی شکل میں دیکھتے ہیں جو ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب کی میراث ہیں۔ اس دور کی تخلیقات عصری زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ پریم چند کے آدرشوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دور میں پریم چند حقیقت کے عرفان سے بے حد قریب ہیں۔ اس دور کے ناولوں افسانوں میں ان کے انقلابی شعور اور ذہن وفکر کی پختگی کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ پریم چند نے ناول میں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے انقلابی تبدیلیاں تھیں اور فنی اعتبار سے اسے نقطۂ عروج تک پہنچادیا۔ ان کا افسانوی ادب ہمارے قومی مزاج اور تہذیبی کردار کا ایسا آئینہ ہے جس میں ہر نقش واضح اور جاندار شکل میں نظر آتا ہے۔ اس دور کے ناولوں میں میدان عمل، گئودان اور منگل سوتر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پریم چند سرمایہ داری کے مخالف تھے لیکن انقلاب کی آواز پوری طاقت سے اس لیے بلند نہیں کرتے تھے کہ انقلاب میں عدم تشدد کا باقی رہنا یقینی نہیں ہے وہ مزدوروں اور غریبوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کسی انقلابی جدوجہد کے بجائے صلح پسندی سے کام لینے کے طرفدار تھے۔ پریم چند مذہب کے مخالف نہیں تھے لیکن فرقہ پرست عناصر دشمن ضرور تھے۔ وہ ان مذہبی رسموں اور اداروں کا مذاق اڑاتے تھے جن میں خلوص سچائی اور روحانیت کی جگہ ریاکاری، عوام دشمنی اور نمائش کی نمود تھی۔

پریم چند کا فن حالات کے ساتھ ترقی کررہا تھا۔ ان کے خیالات واقعات کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کی روح میں اتر کر ان کے کرب و اضطراب ان کی مایوسی اور امید ان کے خوابوں اور خیالوں کو دیکھ سکتے تھے۔ وہ انہیں اس حال سے نکال کر ایک بہتر زندگی دینا چاہتے تھے۔ وہ عوام کی تکلیفوں اور خوشیوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے عوام کے مقابلے میں دوسرے طبقات کے مظالم کا پردہ چاک کیا۔ اگرچہ وہ طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے ان پر نظر نہ ڈال سکے۔ لیکن عوام کا ساتھ انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا اسی وجہ سے ان کی عوام دوستی ان کی بلند نگاہی کے مجموعی اثرات کے سامنے ان کا بعض قدیم تصورات کو عزیز رکھنا معمولی چیز معلوم ہوتا ہے اور پریم چند ترقی پسندی کی روایت کا اہم زینہ بن جاتے ہیں پریم چند کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے انسان دوستی کے اس بے پناہ طوفان کو دیکھنا چاہئے جو غلاموں مزدوروں، کسانوں اور اچھوتوں اور مظلوموں کے یے ان کے دل میں اٹھ رہا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پریم چند نے اس عام انسان کو شاہزادوں سے بڑھ کر حسن اور دلنوازی بخشی۔

☆☆

ڈاکٹر نسرین رئیس خان

پطرس بخاری

یکم اکتوبر 1898 میں پیشاور میں پیدا ہونے والے پطرس بخاری کا اصلی نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ پطرس ان کا قلمی نام ہے۔ ان کے والد سید اسداللہ شاہ بخاری ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پطرس نے اپنی ابتدائی تعلیم پیشاور میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ انگلیستان گئے وہاں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جو تعلیم کا ایک اعلیٰ مقام خیال کیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے انگریزی ادب کی اول درجہ کی ڈگری حاصل کی۔ اورعمانویل کالج کے ایک سینئر اسکالر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا۔ اور گورنمیٹ میگزین ذراوی کے مدیر بھی رہے۔ اس کے علاوہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے استاد کے قلمی نام سے (جو اس وقت کافی شہرت رکھتے تھے) مضامین لکھتے رہے۔ 1922 میں لاہور کے گورنمیٹ کالج میں لیکچر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اپنی انتھک محنت اور قابلیت کی وجہ سے انھوں نے اقوام متحدہ میں مستقیل نمائندے کے طور پر شمولیت اختیار کی۔ لاہور گورنمیٹ کالج کے پرنسپل کے فرائض بھی انجام دئے۔ ماہر تعلیم ونشریات کے طور پر بھی ان کا ایک اعلیٰ اور قابل احترام مقام ہے۔

پطرس بخاری ہمارے بہترین انشاپرداز اور مضمون نگار ہیں۔ انشاپردازی زبان کی انشائی اور اظہاری خوبی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں زبان کا سادہ اور سلیس ہونا گفتگو کے آداب اور سلیقے طریقے کو بہتر انداز میں کام میں لانا ہے۔ اردو مزاح نگاری میں جو نیا انداز اور اسلوب پطرس نے اختیار کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مزاح نگاری میں ایک نئے دبستان کے سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

پطرس بخاری کی بنیادی تعلیم وتربیت انگریزی سے ہوئی ہے۔ اور انگریزی ادب سے روشناسی ہی کی وجہ سے ان میں مزاح کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ انھیں انگریزی ادب پر عبور حاصل تھا۔ وہ صرف اردو ادب کے ہی نہیں بلکہ انگریزی زبان کے بھی لائق اعتبار انشاپرداز تھے۔ اپنی غیر معمولی انوکھی اور دلچسپ مزاح

نگاری سے پہچانے جانے والے پطرس اردو نثر میں خالص مزاح کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ ان کی مزاح نگاری میں انگریزی اثرات کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن پطرس کی خوبی یہ ہے کہ انگریزی اثر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے معاشرے کے پس منظر کو اس میں اس طرح رچابسا دیا ہے۔ کہ ان کی نگارشات خالص تخلیقی ادب کا درجہ اختیار کرگئیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پطرس نے اگرچہ مغربی ادب سے تاثرات قبول کئے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں ہر جگہ مقامی خصوصیات کا رنگ بکھرا نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی میں جو طنز نگار ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان میں سید محفوظ علی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، فلک پیما، پطرس بخاری، کہنیالال کپور، اور مشتاق احمد یوسیفی زیادہ اہم اور مشہور ہیں۔ ان کے یہاں طنز سے زیادہ مزاح کی اہمیت ہے۔ پطرس ہماری ادبی دنیا میں ایک مجموعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے تضادات سے لطف اٹھانے کا ملکہ فوراً ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ سویرے جو کل میری آنکھ کھلی، ہو یا کتے، یا لاہور کا جغرافیہ یا مرحوم کی یاد میں، ان سب میں پطرس کا مزاح آرٹ کی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ہمارا طنز و مزاح جو اب تک ہزل، پھکڑ پن اور عامیانہ پن کا شکار تھا۔ اور یہ رویہ ایک عرصے سے جاری تھا اس میں اچانک ایک تبدیلی آئی۔ اور اس میں صحت مند کیفیات کا خون گردش کرنے لگا۔ ہمارے مزاح نگاروں نے مغربی ادب میں خالص مزاح کے حربوں یعنی واقعہ کردار، موازنہ، مبالغہ، اور اسٹائل کی ظرافت کو بھی اپنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ اور ان کی مدد سے مزاح نگاری کو پروان چڑھانے کی قابل قدر اور لائق ستائش کوشش انجام دی۔

پطرس جیسے مزاح نگاروں کے یہاں موازنہ، مبالغہ، کردار، واقعہ، اور اسٹائل ایک مخصوص زوایہ نگاہ سے مل کر اپنے کام کو انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعہ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک واقعے کے تانے بانے کچھ ایسے نیچرل انداز میں تیار کرتے ہیں۔ اور اس کے نتائج اسقدر غیر متوقع ہوتے ہیں۔ کہ اکثر اوقات تو ہم اپنی ہنسی ضبط نہیں کرپاتے۔ اور جب کبھی ان کے کسی واقعہ کا خیال آجاتا ہے۔ تو ہنسی بے اختیار نکل جاتی ہے مثال کے طور پر کتے ان کا ایک ایسا ہی مزاحیہ انشائیہ ہے۔ کہ کبھی اس کا خیال آجائے تو انسان خود کو تھوڑی دیر کے لئے ایسے ہی مضحکہ خیز ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ کہ جہاں واقعی کتوں کا مشاعرہ ہورہا ہے۔ کسی کتے کی لمبی آواز سنکر پطرس کا کتوں کا مشاعرہ یاد آتے ہی ہنسی خود بخود نکل جاتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے مزاح کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے مزاح نگاری میں جو نیا انداز اختیار کیا وہ ہمیں اردو میں اکثر و بیشتر مفقود نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے کام لینا بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ پطرس نے اردو مزاح نگاری میں جو نیا اسلوب نیا انداز اپنایا۔ وہ مزاح نگاری میں ایک نئے اسکول ایک نئے باب کے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھوں نے اردو مزاح نگاری کو انگریزی مزاح نگاری جیسا معیار اور انداز دیا ہے۔ پطرس کا انداز تحریر نہایت شگفتہ دل آویز دلچسپ پرکشش اور نکھرا ہوا ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی واقعہ میں بھی طنز اور مزاح کے وہ پہلو تلاش کر لیتے ہیں کہ جن کے بارے میں ایک عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ نہایت خوبی سے بھر پور رنگینی اور انتہائی پرکشش انداز میں کچھ اس طرح اس معمولی واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ پھر وہ واقعہ یادگار بن جاتا ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ پطرس ہمارے ایک کامیاب اور بڑے مزاح نگار ہیں۔ ان کے کامیاب اور مشہور انشائیے ۔مرید پور کا پیر، سنیما کا عاشق، کتے، سویرے جو کل میری آنکھ کھلی، میں ایک میاں ہوں ، لاہور کا جغرافیہ، ہوسٹل میں پڑھنا، وغیرہ ہیں۔ ان کے یہاں طنز سے زیادہ مزاح ہے۔ اور اس میں شخصیات پر آزادانہ نظر زبان اور محاورے پر عبور کے سبب سے بڑا بانکپن آ گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ پطرس انگریزی ادب کے بھی بڑے شناس تھے۔ اور اردو ظرافت کی روایت اور پس منظر پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو کی طرح انگریزی ادب میں بھی ایک بلند پایہ انشاپرواز تصور کئے جاتے تھے۔ فنون لطیفہ میں انھیں مصوری اور موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ظرافت مشرقی اور مغربی ظرافت کا ایک خوبصورت نمونہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اور وہ اس کو پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاھرہ

علم بیان ،اقسام نثرواقسام شاعری

شعری و ادب کا فنون لطیفہ سے ایک گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے ۔ یہ ایک ایسا فن ہے جسے اپنے کو اراستہ اور دلاویز بنانے کا ہنر آتا ہے ۔ گویا شناعی اس کے خمیر میں شامل ہے ۔ اس لیے شاعر و ادیب یا کوئی اور بھی وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ خیالات کو پیش کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں ایک تاثر ایک نیا پن پیدا ہو۔ موقع محل کی مناسبت سے مفہوم واضح ہو رہے ہوں۔ مضمون ادا کرنے کے نئے نئے انداز ہوں اور ہر انداز کی نوعیت پہلے سے مختلف ہو۔ اور مزید حسن میں بھی اضافہ ہو رہا ہو۔ تو علم بیان ایک ایسا فن ایک ایسی خوبی کا نام ہے جس میں اوپر دیئے گئے قاعدے اور ضابطے موجود ہوں۔ اس علم کا موضوع لفظ ہے اور اس کے چار ارکان ہیں۔ تشبیہ ،استعارہ ،مجاز مرسل اور کنایہ۔ یعنی اگر معنی کو سمجھانے کے لیے اظہار کے لیے دو یا زیادہ لفظ استعمال کیے جائیں تو ان چارو چیزوں میں سے کسی چیز کی نسبت ہوگی۔ یہی علم بیان کا مقصد ہے علم بیان کو علم ادب و علم کتاب بھی کہتے ہیں۔

شبلی نعمانی نے تشبیہ اور استعارے کی تعریف یوں بیان کی ہے ۔ ''تشبیہات او راستعارات کلام حسن کو بڑھانے کے لیے زیورات کا کام کرتے ہیں اس کے ذریعہ اصل معاملہ کی تصویر بخوبی سامنے آتی ہے جس قدر یہ دونوں اپنی اصلی صورت میں پیش کی یجاتے ہیں اتنا ہی ان میں اصلی حسن باقی رہتا ہے لیکن بغیر تھوڑے مبالغہ کے استعارہ یا تشبیہہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔''

تشبیہ:

تشبیہ کے معنی ہی ں کسی چیز کو کسی چیز کے مشابہ باہم شکل قرار دینا۔ ایک چیز کو کچھ ملتی جلتی صفات کی بنا پر دوسری کے مانند ٹھہرانا۔ مثلاً چاند سا چہرہ، پتھر جیسا دل، یا قوت جیسے ہونٹ وغیرہ وغیرہ۔ جس چیز کو تشبیہہ دی جاتی ہے اس کو ''شبہ'' اور جس چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے اس کو مشبہ بہ کہتے ہیں۔ تشبیہ کے لیے جو جملے استعمال ہوئے جیسے چہرہ، دل، ہونٹ شبہ اور چاند، پتھر، یا قوت مشبہ بہ استعمال ہوئے۔ میر انیس کے اس شعر میں تشبیہ کو دیکھئے ___

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس شعر میں اوس کے قطروں کو موتیوں سے تشبیہہ دی گئی ہے جو تشبیہات دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) مفرد تشبیہات

(۲) مرکب تشبیہات

مفرد تشبیہات: میں ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند بتانا یا قرار دینا جیسے چہرے کو پھول، چاند، آئینے سے اور دل کو شیشہ، پتھر، ماہی اور کنول وغیرہ سے تشبیہہ دینے کو مفرد تشبیہات کہیں گے۔ مثال کے طور پر میرؔ کا یہ شعر

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

مرکب تشبیہات: اس میں ایک بات کو کہنے کے لیے دو چیزوں کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہیں۔ اور ان کو دو الگ چیزوں سے مشابہت دیتے ہیں۔ مثلاً میدان جنگ میں گردو غبار کے درمیان تلواریں چمک رہی تھیں جیسے شب میں ستارے ٹوٹ رہے ہونگے۔

پیڑ کے سبز پتے رنگ میرا ان میں لال
جس طرح کا ہی دوپٹے میں کسی گلرو کے گال

استعارہ:

استعارہ لفظ مستعار سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ادھار لینا۔ مگر اصلاح میں کسی لفظ کے جو اصل معنی ہو اس میں نہ استعمال ہو کر کسی دوسرے معنی میں استعمال ہو اور دونوں معنوں کے بیچ تشبیہی لگاؤ ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ جیسے معشوق کے لیے ماہ رو وغیرہ کا استعمال استعارہ کہلائے گا۔ مثلاً جیسے یہ جملہ ہے کہ شیر دشمن کے چھکے چھڑا دو تو یہاں شیر اپنے اصل معنی میں نہ استعمال ہو کر بہادر کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لیے شیر استعارہ ہے۔ اقبال کی نظم جگنو کا یہ شعر دیکھئے۔

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

ربط رنے لگا اس شمع کو پروانے سے
آشنائی کا کیا حوصلہ بیگانوں سے

شمع سے مراد محبوب کے اور پروانوں سے مراد عاشق کے ہی ں اور دونوں میں تشبیہی لگاؤ بھی ہے کوئی تشبیہہ نہیں ہے بلکہ تشبیہی لگاؤ ہے جو استعارے کے لیے ضروری ہے۔

استعارہ میں تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

(الف) مستعارمنہ: اس چیز کو مستعار منہ کہتے ہیں جس سے کچھ مانگا جائے۔

(ب) مستعارلہٗ: اس چیز کو جس کے لیے مانگا جائے۔

(ج) مستعار: وہ چیز جو استعارے میں مانگی گئی اسے مستعار کہتے ہیں۔

مجاز مرسل:

جب کسی لفظ کے اصل معنی کو ترک کرنے اس کو کسی مجازی معنی میں استعمال کریں تو مجاز مرسل کہلاتا ہے بس شرط یہی ہے کہ لغوی اور مجازی دونوں طرح سے اس میں تشبیہی لگا نہ ہو جیسے کہ دریا بہہ رہا ہے۔ دریا کی مثال پانی ہے چونکہ دونوں میں تشبیہی تعلق ہے اس لیے دریا مجاز مرسل کہلائے گا۔

اس کا کوئی گود کا پالانہ تھا
گھر میں کوئی گھر کا اجالانہ تھا

زخم کی داد نہ دی تنگی دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرا فشاں نکلا

آ کے ساقی نہ ستا مجھ کو ادھر یہی رہ
ساغر عیش ہے جدھر کو جہاں ہے شیشہ

کنایہ:

کنایہ کے معنی ہیں بات صاف نہ کہہ کر پوشیدہ طور پر کہی جائے یعنی کسی خیال کو براہ راست ادا نہ کیا جائے ان کو مجازی معنی کے علاوہ حقیقی معنوں میں بھی لے سکتے ہیں۔

لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی
بوسنگھا دو تم اپنے بالوں کی

کالے سے مراد یہاں کالا ناگ ہے جو یہاں پر کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

چاک پردہ سے یہ غمزہ ہیں تو یہ پردہ نشیں
ایک میں کیا سبھی چاک گریباں ہونگے

چاک گریباں سے مراد عاشق کے ہیں۔

اردو ادب میں کلام کی دو قسمیں ہیں، نثر اور نظم۔

اردو نثر:

اردو نثر ادب کی ایک خاص صنف ہے اس لیے اردو شاعری ہی کی طرح انسانی معاشرے سے قریب ہے حالانکہ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر زبان میں نثر کا ارتقاء شاعری کے بعد میں ہوا ابتدائی میں انسانی زندگی ایک قسم کی ہے ربطی تھی اس لیے ان کی زبان میں نکھار پیدا نہ ہوسکا مگر جیسے جیسے انسانی دماغ نے ترقی کی اس نے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی اس طرز زندگی کے اظہار کے لیے زبان کو پیش کرنا ناگزیر تھا۔

ابتدائی نثر کے نمونے سکوں مٹی کے برتنوں، پتھروں، درخت کی چھالوں پر دکھائی دیتے ہیں جو بعد میں بولی کی شکل میں رونما ہوئے اس پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا بے حد ضروری ہے کہ نثر سے مراد کیا ہے ٹی۔ شیلے۔ نے نثر کے بارے میں لکھا ہے۔

''وہ عام طرز گفتار تا تحریری جو شعری سے مختلف ہو''

انسائیکلوپیڈیا برٹنکا میں نثر کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

''نثر'' بنی نوع انسان کی وہ عام گفتگو کو کہتے ہیں جو بہت ہی سادہ ہو اور نظم کے قواعد سے حرا ہو ادبی اصطلاح کے طور پر یہ نظم سے مختلف مضمرات ہیں اس وجہ سے ادبی نثر بہترین ذریعہ اظہار ہے یہ لاطینی لفظ پروز (ابتدائی پروز) سے مشتق ہے جس کا مفہوم راست یا بلاواسطہ ہے اس لیے بعض اشخاص کا نظریہ ہے کہ نثر کو سیدھی سادی زبان میں ہونا چاہیئے۔ جس سے زبان کی سچائی یا ثبوت واقعتاً یا عقلاً ظاہر ہو۔

نثر کی قسمیں: نثر کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے نثر کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) مرجّز (۲) مقفّیٰ (۳) مسجع (۴) عاری

(۱) مرجّز: وہ نثر ہے جس میں شعر کا دان ہو اور قافیہ نہ ہو۔

(۲) مقفّیٰ: وہ نثر ہے جس میں قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔

(۳) مسجع: وہ نثر ہے جس میں فقروں کے الفاظ وزن میں برابر ہوں اور فقرے کا آخری لفظ دوسرے فقرے

کے آخری لفظ کا ہم قافیہ ہو۔

(۴)عاری نثر: وہ نثر ہے جن کے الفاظ میں وزن اور قافیہ کی قید نہیں معنی کے اعتبار سے نثر کی قسمیں۔

معنی کے اعتبار سے نثر کی دو قسمیں سلیس اور دقیق۔

سلیس سے مراد آسان اور دقیق سے مراد معنی یا مطلب دقت سے سمجھ میں آئے مشکل در پیش ہو سلیس نثر بھی دو قسم کی ہوتی ہے اور دقیق نثر بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) سلیس سادہ (۱) دقیق سادہ

(۲) سلیس رنگین (۲) دقیق رنگین

سلیس سادہ: جس میں مطلب سیدھے سادے انداز میں ادا کیا ہو۔

سلیس رنگین: اس نثر میں مطلب تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے مگر لکھنے والے نے اسے بڑی رعایت اور مناسبت سے ادا کیا ہو۔

دقیق سادہ: جس سے معنی دقت سے سمجھ میں آئیں مگر مطلب کو بغیر رعایت اور مناسبت سے ادا کیا گیا ہو۔

دقیق رنگین: وہ نثر جس کا مطلب سمجھنے میں مشکل ہو اور لکھنے والے نے بھی رعایت لفظی اور مناسبت کا خاصا اہتمام کیا ہو۔

نظم:

''شعر کلام موزوں چند شعروں کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون پر ہوں'' انسان او رفنون لطیفہ کا ایک دوسرے سے اٹوٹ رشتہ ہے فنون لطیفہ میں بھی اس کا شدید جذباتی لگاؤ موسیقی او رشاعری سے ہے چنانچہ بچوں کو سلانے کے لیے مائیں لوریاں سناتی ہیں جس کے اثر سے مسحور ہو کو بہت جلد نیند کی آغوش میں پہونچ جاتے ہیں۔ شاعری اسی موسیقی کی روح کہی جاسکتی ہے دنیا کی ہر قوم کسی نہ کسی انداز میں نثر کی بہ نسبت شاعری کی دلدادہ رہی ہے ۔ انسان کی جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی شاعری سے ہوتی ہے نظم بھی شاعری کا ایک حصہ ہے ۔

نظم کے لغوی معنی لڑی کے ہیں جس میں موتیوں کو پرویا جاتا ہے گویا ان کو ایک دھاگے کی لڑی میں پرو دیا گگیا جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا۔ اور وہ اراستہ بھی ہوگئی لیکن شاعری میں نظم سے مراد وہ اوصاف اور اسالیب ہیں جن میں کسی خاص موضوع پر ربط اور تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی نظم کے لیے خیال کا تسلسل اور وحدت ضروری سمجھتے ہیں ان کے الفاظ ہیں۔

''نظم مسلسل روشنی ہے نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز ہیں کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں مناسب وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ضروری ہے''

احتشام حسین نے لکھا ہے۔''اردو ادب میں نظم کا لفظ دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہو رہا ہے ۔عام حیثیت تو یہ ہے کہ پر شاعرانہ تخلیق کو نظم کہہ سکتے ہیں چاہے وہ مختصر ہو یا طویل یہ بھی شرط ہیں کہ وہ کسی خاص شکل میں ہو۔ اپنے دوسرے مفہوم میں لفظ نظم ایک مسلسل مربوط اور ارتقاء کی شاعرانہ تصنیف کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔''

نظم کی تقسیم دو اعتبار سے کی جاتی ہے ۔

(۱) باعتبار ہیت (۲) باعتبار مواد

اقسام نظم باعتبار ہیت: اس میں جو اصناف شامل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) مثنوی (۴) رباعی (۵) قطعہ (۶) مسمط (۷) ترکیب بند (۸) ترجیع (۹) مستزاد (۱۰) فرد

اقسام نظم باعتبار مواد: مواد اود مضمون کے اعتبار سے اس میں مندرجہ ذیل اصناف شامل ہیں:

(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) مثنوی (۴) واسوخت (۵) مرثیہ (۶) سلام (۷) نوحہ (۸) شہراشوب وغیرہ۔

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

مضمون نگاری، ترجمہ نگاری اور تشریح

''کسی موضوع کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق اپنے خیالات کو آسان، خوبصورت اور موزوں الفاظ میں اس طرح تسلسل کے ساتھ بیان کرنا کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ جائے۔ مضمون نویسی کہلاتا ہے۔''

(شفیع احمد صدیقی)

مضمون نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے زبردست معلومات، زبردست مطالعہ اور لکھنے کی بہت مشق ہونی چاہیے۔ وسیع مطالعے سے بڑے فائدے بھی ہیں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ہم میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی موضوع پر مضمون لکھنے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ زبان پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ بس مضمون کی ترتیب اور الفاظ کی ادائیگی اتنے سلیقے سے ہو کہ اس کو پڑھنے میں دلچسپی بڑھ جائے۔

مضمون نگاری میں کن باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے اس کے بارے میں شفیع صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

1۔ ''مضمون لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا ایک خاکہ ذہن میں بنا لیا جائے جس پر مضمون لکھنا ہے یعنی مضمون کی تمہید کیا ہو۔ کون کون سی باتیں کس کس ترتیب سے لکھی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

2۔ اپنے خیالات کو ادا کرنے لیے آسان، پر اثر اور صحیح زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ تحریر میں الجھاؤ الفاظ کی تکرار اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

موضوعِ تحریر میں تسلسل اور ربط مضمون نویسی کی جان ہے جس موضوع پر مضمون لکھنا ہو اس کے متعلق زیادہ معلومات ہونی چاہیے۔ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے حکومت وقت، کسی جماعت مذہب یا فرد کی تضحیک ہوئی

نظم:

''شعر کلام موزوں چند شعروں کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون پر ہوں'' انسان او رفنون لطیفہ کا ایک دوسرے سے اٹوٹ رشتہ ہے فنون لطیفہ میں بھی اس کا شدید جذباتی لگاؤ موسیقی او رشاعری سے ہے چنانچہ بچوں کو سلانے کے لیے مائیں لوریاں سناتی ہیں جس کے اثر سے مسحور ہو کو بہت جلد نیند کی آغوش میں پہونچ جاتے ہیں۔ شاعری اسی موسیقی کی روح کہی جاسکتی ہے دنیا کی ہر قوم کسی نہ کسی انداز میں نثر کی بہ نسبت شاعری کی دلدادہ رہی ہے۔ انسان کی جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی شاعری سے ہوتی ہے نظم بھی شاعری کا ایک حصہ ہے۔

نظم کے لغوی معنی لڑی کے ہیں جس میں موتیوں کو پرویا جاتا ہے گویا ان کو ایک دھاگے کی لڑی میں پرو دیا گگیا جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا۔ اور وہ اراستہ بھی ہوگئی لیکن شاعری میں نظم سے مراد وہ اوصاف اور اسالیب ہیں جن میں کسی خاص موضوع پر ربط اور تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی نظم کے لیے خیال کا تسلسل اور وحدت ضروری سمجھتے ہیں ان کے الفاظ ہیں۔

''نظم مسلسل روشنی ہے نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز ہیں کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں مناسب وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ضروری ہے''

احشام حسین نے لکھا ہے۔''اردو ادب میں نظم کا لفظ دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔عام حیثیت تو یہ ہے کہ پر شاعرانہ تخلیق کو نظم کہہ سکتے ہیں چاہے وہ مختصر ہو یا طویل یہ بھی شرط ہیں کہ وہ کسی خاص شکل میں ہو۔ اپنے دوسرے مفہوم میں لفظ نظم ایک مسلسل مربوط اور ارتقاء کی شاعرانہ تصنیف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''

نظم کی تقسیم دو اعتبار سے کی جاتی ہے۔

(۱) باعتبار ہیت (۲) باعتبار مواد

اقسام نظم باعتبار ہیت: اس میں جو اصناف شامل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) مثنوی (۴) رباعی (۵) قطعہ (۶) مسمط (۷) ترکیب بند (۸) ترجیع (۹) مستزاد (۱۰) فرد

اقسام نظم باعتبار مواد: مواد اود مضمون کے اعتبار سے اس میں مندرجہ ذیل اصناف شامل ہیں:

(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) مثنوی (۴) واسوخت (۵) مرثیہ (۶) سلام (۷) نوحہ (۸) شہراشوب وغیرہ۔

مضمون نگاری، ترجمہ نگاری اور تشریح

''کسی موضوع کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق اپنے خیالات کو آسان، خوبصورت اور موزوں الفاظ میں اس طرح تسلسل کے ساتھ بیان کرنا کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ جائے۔ مضمون نویسی کہلاتا ہے۔''

(شفیع احمد صدیقی)

مضمون نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے زبردست معلومات، زبردست مطالعہ اور لکھنے کی بہت مشق ہونی چاہیے۔ وسیع مطالعے سے بڑے فائدے بھی ہیں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ہم میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی موضوع پر مضمون لکھنے میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ زبان پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ بس مضمون کی ترتیب اور الفاظ کی ادائیگی اتنے سلیقے سے ہو کہ اس کو پڑھنے میں دلچسپی بڑھ جائے۔

مضمون نگاری میں کن باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے اس کے بارے میں شفیع صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

1۔ ''مضمون لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا ایک خاکہ ذہن میں بنا لیا جائے جس پر مضمون لکھنا ہے یعنی مضمون کی تمہید کیا ہو۔ کون کون سی باتیں کس کس ترتیب سے لکھی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

2۔ اپنے خیالات کو ادا کرنے لیے آسان، پر اثر اور صحیح زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ تحریر میں الجھاؤ الفاظ کی تکرار اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

موضوعِ تحریر میں تسلسل اور ربط مضمون نویسی کی جان ہے جس موضوع پر مضمون لکھنا ہو اس کے متعلق زیادہ معلومات ہونی چاہیے۔ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے حکومت وقت، کسی جماعت مذہب یا فرد کی تضحیک ہوئی

مضمون کو کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہیے پورے مضمون کو ایک پیراگراف میں لکھنا غلط ہے۔
پورے مضمون کو لکھ لینے کے بعد ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہیے۔''

عموماً مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں پہلا ''تمہید'' ہے۔ یہ مضمون کا پہلا حصہ ہوتا ہے۔ مضمون اسی موضوع پر لکھنا چاہیے جس پر ہماری آپ کی معلومات زیادہ ہو اور جو وقت ملا ہے اس میں مضمون پورا لکھا جا سکے، مضمون اتنا چھوٹا بھی نہ ہو کہ نفس مضمون بھی غائب ہو جائے۔ تین سو الفاظ کا مضمون معیاری مانا جاتا ہے۔

مضمون کا خاکہ ذہن میں ہے تو بہت اچھی بات ے مثال کے طور پر کسی شخص کے متعلق۔ چاہے وہ شاعر ہو ادیب ہو یا کوئی اور بھی جس کی ذات سے ملک یا معاشرے کو فائدہ پہنچا ہو۔ نمایاں کارکردگی رہی ہو تو ہمیں ان باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔

تمہید:

نام خاندان تاریخ پیدائش جائے پیدائیش، تعلیم و تربیت اس کے اہم کارنامے عادت و خصلت اس نے کیا کیا یاد گاریں چھوڑیں ہیں و فات کب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

کسی تاریخ عمارت پر لکھنے کی بات ہو تو ''تاج محل'' پر لکھ سکتے ہیں یا تاج محل پر سیدھے سیدھے لکھنے کو کہا جائے سب سے پہلے تو یہ کہ تاج محل سات عجائبات میں سے ایک ہے مغل بادشاہ شاہجہاں نے کیوں بنایا۔ وعدع کی اہمیت اپنی بیگم، ممتاز محل سے بے انتہا لگاؤ پھر اس کی صناعی اس کی خوبصورتی وغیرہ وغیرہ ایک بات اور خیال رکھنے کی ہے کہ مضمون کی تمہید اور اس کا اختتام دونوں موثر انداز میں لکھا ہونا چاہیے۔ بہت سنجیدہ موضوع ہے خشک موضوع ہے تو اس میں آپ کسی نہ کسی طرح سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مزاحیہ انداز بھی اپنا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے موضوع ہے جس پر مضمون لکھا جا سکتا ہے شرط یہ ہے کہ ہم آپ اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔

تشریح:

امتحان کے پرچہ میں ایک سوال تشریح کا بھی ہوتا ہے۔ جو بہت اہم ہے آپ تشریح اسی وقت اچھی طرح کر سکتے ہیں جب آپ نے سبق کو بار بار پڑھا ہوگا۔ اس لیے درسی کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے درسی کتاب کے کسی بھی سبق میں سے دو یا تین پیراگراف دیئے جائیں گے۔ سوال اس طرح ہوگا:

ذیل کے اقتباسات میں سے کسی ایک کی تشریح سیاق و سباق کے ساتھ کیجئے۔

پہلے آپ اچھی طرح سے دو تین بار اس کو پڑھیں سمجھ میں آجائے کہ اب ہم اس پیراگراف کی تشریح اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اور مصنف کا نام ہیں مے معلوم ہے۔ تب آپ لکھنا شروع کریں تشریح کے لیے جو پیرا گراف ہے جواب اس سے بڑا ہونا چاہیے۔ اور خاص اپنی زبان استعمال کرنی چاہیے۔ یہ سوال لازمی ہوتا ہے اس لیے بہت اہم ہے۔

مثلاً آپ درسی کتاب کے سبق ـــــ ''دنیا بہ امید قائم ہے'' سے کوئی پیراگراف آجاتا ہے تو آپ کو چاہیے کہ پہلے آپ یہ دیکھیں کہ اس پورے سبق میں سرسید احمد خاں نے کیا بتانے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر اس پیرا گراف میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پڑھنے کے بعد یہ کہ مصنف کہتا ہے اور لکھنا شروع کر دیا۔ سرسید احمد خاں کے بارے میں آپ تھوڑا بہت لکھیں ـــ مثلاً اس سبق میں انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے ـــــ امید ایک ایسا جذبہ ہے جس کے ذریعہ ہم اور آپ اپنے حسین خوابوں کی تکمیل کرتے ہیں امید ایک آئیڈیل زندگی گزارنے میں سو فیصدی ہمارا ساتھ دیتی رہی ہے۔ یہی امید ہے جس نے ہر دور میں نبیوں پیغمبروں کی مدد کی۔ رہنمائی کی جہاں کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں جمود طاری ہو گیا ہے تو یہی امید اسے رواں دواں کرتی ہے امید ایک ایسی شہ ہے جو ہمارے وجود کے ساتھ ساتھ ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس اس کا ساتھ دیتی ہے دنیا کا ہر رشتہ امید کے سہارے جڑا رہتا ہے۔ سرسید نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''یہ امید کی خوشیاں ماں کی اس وقت تھیں جب بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کو شاد کرنے لگا۔ اماں اماں کہنا سیکھا اس کی پیاری اور ادھورے لفظوں میں اس کی آواز ماں کے کان میں پہنچنے لگی آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا پھر کتب سے اس کا سروکار پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان سے بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں اور پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔''

پھر آپ اس پیراگراف پر آئیں جو پیپر میں آیا ہے اس کو اچھی طرح پڑھیں اور اس کی تشریح کریں۔ ایک بات خاص کر ذہن میں رکھیے کہ جیسا آپ کا مطالعہ ہوگا تیاری ہوگی۔ ویسی آپ کو کامیابی ملے گی۔

سوال کے دوسرے حصے کو دیکھیے جو شعری اقتباسات سے متعلق ہوگا۔

سوال: ذیل کے شعری اقتباسات میں سے کسی ایک کی تشریح مع سیاق وسباق کیجیے۔

اس میں وہ شعرا جو نصاب میں داخل ہیں ان کی غزل کے اشعار اور نظم کو ٹکڑا ہوگا۔ فرض کیجیے کہ اقبال کی نظم ''شعاع امید'' بھی اس میں شامل ہے تو اس کی تشریح سے پہلے آپ اقبال کی نظم نگاری کے بارے میں لکھیں جیسے:

نظم جدید کی تاریخ میں اقبال کی شاعری کو کبھی بھی نظم انداز نہیں کیا جاسکتا ان کی نظمیں ایک تاریخی موڑ رکھتی ہیں اقبال نے زیادہ تر نظمیں لکھیں جیسے قومی وطنی۔ ملّی۔ تاریخی دعائیہ نظمیں غرض کہ نظموں کے مختلف انداز انہیں جابجا دکھائی پرتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں فکری عنصر بہت زیادہ حاوی ہے جس کو ہم فلسفہ طرازی کا نام دے سکتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں فلسفیانہ جذبات میں ڈوبی نظر آتی ہیں جیسے شمع، موج دریا، سرگذشت آدم، جگنو، بچہ اور شمع، محبت، نوائے غم، فلسفہ غم انسان کا مکالمہ بزم انجم، شعاع امید وغیرہ۔ پھر نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیں۔

مرکزی خیال یہ کہ اقبال نے وطن کے مسائل کو جگہ جگہ اپنے خیال کا عنوان بنایا ہے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے فکر مند تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی بیداری پوری ایشیاء کی بیداری ہے۔ اس لیے وہ ہندوستانی کو بیدار کر کے قوم کی حالت میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے مسلسل عمل وحرکت کا پیغام دیا۔ انہیں ایسا لگتا تھا کہ ان کے سہارے زندگی کی ہر جنگ جیتی جاسکتی ہے انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ دنیا کو اپنے قبضے میں کرسکتا ہے نصاب میں ادخل اقبال کی نظم ''شعاع امید'' بھی اسی جذبے کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔

اس طرح غزل کے اشعار میں حسرت موہانی کی غزل کا شعر ہے آپ نے پہچان لیا اور آپ تشریح کرنا چاہتے ہیں تو آپ حسرت موہانی کی غزل گوئی کے بارے میں لکھیں زیادہ نہیں دو چار لائین حسرت موہانی کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے کہا کہ: ''غزل گوئی کوئی کرے غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔'' اور بھی بہت کچھ جو حسرت موہانی کے بارے میں جو آپ نے پڑھا ہو۔ پھر شعر کی تشریح کریں۔ اسی طرح دوسرے شاعر کے بارے میں بھی جواب لکھنے سے پہلے آپ کا مطمئین ہونا بے حد ضروری ہے۔ مطمئن آپ اس وقت ہوں گے جب آپ کی تیاری اچھی ہوگی۔

آپ اردو جانتے ہیں بہت اچھی بات ہے۔ مگر ایک بات بہت اہم اور قابل غور بھی ہے کہ اردو زبان جاننا اور اردو ادب جاننے میں بہت فرق ہے۔ اس لیے اردو کو ایسے پڑھیں اس کی تیاری ایسے کریں کہ آپ کو اردو ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ نہ کہ آپ یہ سوچیں کہ اردو تو ہے پڑھ لیں گے ایسا نہ سوچیے اردو میں بھی اتنی ہی محنت کریں جتنی اور مضمون میں کرتے ہیں یقیناً کامیابی ملے گی۔

ترجمہ نگاری:

ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے اس کے بھی ضابطے اور قاعدے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے لکھا ہے:

''ترجمہ کا مفہوم کسی خیال کا دوسرے تک منتقل کیا جانا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا آغاز انسانی تہذیب کی ابتدا

سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انسان نے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے لکڑی اور لکیر کا سہارا لیا۔ بعد ازاں ان ٹوٹی اور بکھری لکیروں کو مربوط کر کے تصویروں کو استعمال کیا یہ تصویریں Hieroglyphies یا مقدس تحریریں قرار پائیں ان سے حروف تہجی ایجاد ہوئے۔ رفتہ رفتہ زبان وجود میں آئی جو مفرد وضع صوتی علامات کا مجموعہ ہے گویا عقیدہ افکار نے زبان کو جنم دیا اور اسے پروان چڑھایا۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ و خیال کی اشاعت وہ اپنے ایمان و عقائد کا حلقہ وسیع بنانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے دوسروں کو ہم مشرب اور ہم راز بنانے کی جدوجہد میں دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتا ہے اور اسے باعث خیر اور موجب نجات سمجھتا ہے یہی جدو جہد اور خواہش ترجمہ کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ اگر مخاطب ہم زبان اور ہم قلم نہیں ہے تو کسی مشترک زبان اور ذریعہ اظہار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمہ کا آغاز ہوا ان مترادفات ہیں تصرفات بھی ہوئے گویا اردو کے عناصر ترکیبی کا ترجمہ کا خمیر شامل ہوا جب زبان اظہار کے قابل ہوتی تو فارسی کے مختلف اصناف سخن کو جوں تاتوں اردو میں منتقل کیا گیا۔ ترجمے کے ساتھ کہیں تصرف اور پھر تخلیق کا دور شروع ہوا لیکن تخلیقی کے مقابلہ میں ترجمہ کا ذخیرہ ادب کہیں زیادہ دقیق اور قابل قدر ہے کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ شاید ترجمہ کا ہی بول بالا رہے۔"

ترجمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو۔ بلکہ ترجمہ کرنے والے کی اپنی تصنیف معلوم ہونے لگے جملوں کی تراش وضاحت روانی اور دلکشی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ ـــــ "ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال خیال کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی پیچیدہ عمل ہے یہ عمل خالص فنی ادبی اور کسی قدر تخلیقی نوعیت کا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت مترجم ابلاغ اور ترسیل کے مسائل سے دو چار ہوتا ہے اس لیے ترجمے کے عمل کے لیے تخلیقی ریاضت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے اس مثلث کا ہر زاویہ اور ہر خط اپنی جگہ موزوں اور متوازن ہونا بھی ضروری ہے۔"

اردو میں جیسے میر امن کی کتب 'باغ و بہار' ہے باغ و بہار کا قصہ فارسی کتاب چہار درویش سے ماخوذ ہے میر امن سے پہلے عطا حسین تحسین نے ترجمہ کیا مگر زبان عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں ہوسکی۔ لیکن میر امن نے اس داستان کو عام سلیس زبان استعمال کر کے اتنا خوبصورت بنا دیا کہ وہ خود ایک تصنیف معلوم ہونے لگی اس کی حیثیت جب کہ ایک ترجمے کی ہے حقیقت تو یہ کہ باغ و بہار کی عظمت اور مقبولیت اس کے اسلوب نگارش پر ہے۔

ترجمہ کرتے وقت ان سبھی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

☆☆☆

فرہنگ اصطلاحات

Table	میز، تختہ
—, of rates	نرخ نامہ
Tablet	تختی
Tabular premium	جدولی پریمیم
Tabular purchase book	تختہ دار خرید بہی
Tabular sales book	تختہ دار فروخت بہی
Tabulator key depression	جدولی کنجی داب
Tabulator scale	جدولی پیمانہ
Tag	ٹیگ، بند
Tailpiece	ذیلی نقش
Take up a bill	بل کی پیشگی ادائیگی
Tally roll	ملان رجسٹر/فرد
Talon coupon	ٹیلن کوپن
Tangible asset	لمسی اثاثہ/مرئی اثاثہ
Tap line	صنعتی ریلوے لائن
Tare	دھڑا

—, weight	ویگن وزن
—, actual	حقیقی دھڑا
—, customary	رسمی دھڑا
—, estimated	تخمینی دھڑا
Target risk	نشانہ خطر
Tariff	نرخ نامہ/ نرخ/محصول
—, agreement	محصول اقرار نامہ
—, retaliatory	جوابی حصول
—, value	محصول قدر
—, equalisation	برابری نرخ نامہ/ نرخ/محصول
—, preferential	ترجیحی نرخ نامہ/ نرخ/محصول
Tax anticipation bond	ٹیکس متوقع بانڈ
Taxable profit	قابل ٹیکس منافع
Teller	زرشمار، ٹیلر
Temperate habits	معتدل عادات
Temporary annuity	عارضی سالیانہ
Temporary disability benefits	عارضی معذوری فوائد
Temporary maladjustment	عارض نا مناسب تطبیق/ عارضی بے ترتیبی
Temporary partial disability	عارضی جزوی معذوری
Tender	ٹینڈر
Tenor of bill (=term of bill)	معیاد بل
Term assurance	میعادی بیمہ
Term bond	معیادی بانڈ
Terminal	اختتامیہ/ اختتامی/ آخری/ سرے کا

Terminal charge	اختتامی بار
Terminal cost (=job cost = order cost)	اختتامی لاگت، جاب لاگت/ آرڈر لاگت/ فرمائش لاگت
Terminal facilities	اختتامی سہولیات
Terminated bond.	معیاد ختم بانڈ
Termination	اختتام
Terms of trade	شرائط تجارت
Test Check	نمونہ جانچ
Testing certificate	جانچ سند
Texture	بناوٹ، گھٹن، بافت
Theory of annuities	نظریہ سالیانہ
Theory of Optimum Population	انسب آبادی، نظریہ
Theory workday	انسب کام دن/ آپٹیمم کام دن
Third party insurance	تیسرا فریق بیمہ
Third Via	تیسری راہ
Three columnar cash book	تین کالم روکڑ بہی/ تین کالم نقد بہی
Through export bill of lading	سیدھا جہازی بل
Through freight	سیدھا برآمد جہازی بل
Through train	سیدھا بھاڑا
Through rate	سیدھی شرح
Through train	سیدھی ٹرین
Tick	نشان لگانا
Time freight	وقت بھاڑا
Time relationship	وقت نسبت
Time table	نظام الاوقات/ ٹائم ٹیبل

Tip	اشارہ/ سرا
Toilet goods	سنگھار سامان
Ton	ٹن
—, mile cost	ٹن میل لاگت
—, mile earnings	ٹن میل آمدنی، ٹن میل کمائی
Tonnage	ٹنیج بھار
—, capacity	ٹنیج صلاحیت/ ٹن وزن صلاحیت/ ٹن وزن گنجائش
—, rating	وزن شرح بندی، تعین شرح وزن
—, tax	وزن ٹیکس
Total creditors' account	کل لین داران کھاتہ
Total debtors' account	کل دین داران کھاتہ
Total disability	مکمل معذوری/ کلی معذوری
Total loss	جملہ خسارہ/ کل نقصان
Total loss, constuctive	تعمیری کل نقصان
Touch tuning	لمسی تطبیق
Touch typewriting	لمسی ٹائپ رائٹنگ
Tourist fare	ٹورسٹ کرایہ، سیاح کرایہ
Tout	دلال
Trackage	عمل کھنچائی، معاوضہ حق کھینا/ کشتی اجرت/ سلسلہ ریل پٹری
Trade	تجارت
—, acceptance	تجارت منظوری
—, allowance	تجارت الاؤنس
Trade barrier	مسدِ تجارت
—, bill	تجارت بل

—, bloc	تجارتی گٹ
—, blockade	تجارتی ناکہ بندی
—, character	تجارتی نوعیت
—, charges account	تجارتی بار کھاتہ
—, classification	تجارتی درجہ بندی
—, creditor	تجارتی لین دار/ بیو پار لین دار
—, description	تجارتی بیان/تجارتی تفصیل
—, directory	تجارتی ڈائرکٹری/ٹریڈ ڈائرکٹری
—, enquire	تجارتی پوچھ تاچھ/معلومات
—, expense account	بیو پار خرچ کھاتہ/تجارتی اخراجات کھاتہ
—, ledger	تجارتی لیجر،تجارتی کھاتہ بہی
—, name	تجارتی نام
—, opportunities	تجارتی مواقع
—, premium	تجارتی پریمیم
—, protection association	انجمن تحفظ تجارت
—, reference	تجارتی حوالہ
—, route	بیو پار راستہ،تجارتی راہ،تجارتی راستہ
—, sanction	تجارتی پابندی یاں
—, air borne	ہوائی تجارت
—, bilateral	دوطرفی تجارت
—, direct	سیدھی تجارت/ بلا واسطہ تجارت
Trade,entrepot"	بین بندرگاہی تجارت
—, land frontier	سرحدی تجارت
—, multilateral	کثیر طرفی تجارت

—, quantum of	مقدار تجارت
—, reciprocal	جوابی تجارت/ باہمی تجارت/ دوطرفہ تجارت
—, restraint of	امتناع تجارت
—, sea borne	بحری تجارت
—, transhipment	جہاز بدلی تجارت
—, triangular	مثلثی/ تکونی تجارت
Trading & manufacturing account	تجارتی و صنعتی کھاتہ، تجارتی و تیاری مال کھاتہ
Trading account	بیوپاری کھاتہ، تجارتی کھاتہ
Trading area	تجارتی علاقہ
Trading capital	تجارتی سرمایہ، بیوپار سرمایہ
Trading down	سستے دام تجارت
Trading up	مہنگے دام تجارت
Trading, private	نجی تجارت
Traffic agreement	ٹریفک اقرار نامہ، ٹریفک راضی نامہ، ٹریفک معاہدہ
Trafficking in import licences	درآمدی لائسنسوں کی چور بازاری
Transaction	سودا، لین دین
Transfer	تبادلہ
—, agent	ٹرانسفر ایجنٹ/ بدل نمائندہ
—, book	تبادلہ بہی
Transfer entry	بدل اندراج
—, journal	بدل جرنل، بدل روزنامچہ
—, of cash	ارسال نقد
—, blank	سادہ/ بے نام تبادلہ
—, book	کتابی تبادلہ

—, cheque	تبادلہ چیک
—, forged	جعلی تبادلہ
Transferable account	قابل تبادلہ کھاتہ
Transhipment	بین جہازی منتقلی
Transit	راہ/عبور
—, advertising	عبوری تشہیر
—, charges	عبوری بار/ دوران راہ خرچے
—, duty	عبوری محصول/عبوری ڈیوٹی
—, office	دفتر عبور
—, policy	عبوری پالیسی
Transport	نقل وحمل، ٹرانسپورٹ
—, charges	نقل وحمل مطالبات
—, means of	ذرائع/ وسائل نقل وحمل
Transportation facilities	آمد ورفت سہولیات
Transposition	نقل مقام
Travel accident policy	سفر حادثہ پالیسی
Travelling expenses account	سفری خرچ کھاتہ

☆☆☆

NOTES

NOTES

NOTES